قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	بدل اشتراک
۴	خط و کتابت	سالانہ
چار روپے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان /۴۸ روپے غیر ممالک /۱۱۰ روپے
شمارہ ۱۰	اکتوبر ۱۹۸۶ء	جلد ۳۹

فہرست

۱۔ لمعات :۔ (مجوزہ شریعت بل میں نئی ترمیم) — — — — — — — ۲

۲۔ قرآن کا پیغام :۔ محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ) — — — — — — ۸

۳۔ ایک سنتِ رسول کی بے حرمتی پر علماء کی خاموشی ! — — — — — ۱۲

۴۔ ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات کی قیمتیں : — — — — — — ۱۵

۵۔ ایمان بلا عمل :۔ علامہ پرویز علیہ الرحمۃ) — — — — — — ۱۷

۶۔ حقائق و عبر :۔ (۱) شریعت بل اور جماعت اہلسنت (۲) شریعت بل سے فرقہ واریت پھیلے گی (۳) پاکستان اور ملّا حضرات (۴) مودودی بھی ملّا ہی نکلا (۵) اولیاء اللہ کی کرامات : (۶) برطانیہ میں پیروں کی گدیاں ! (۷) اہلحدیث کی کٹ حجتی اور غلط بیانی ۲۴

۷۔ محترم پرویز صاحب کا ہفتہ واری درسِ قرآنِ کریم (بذریعہ وی سی آر) — — — — ۳۱

۸۔ جنگ اور انسان : (علامہ پرویز علیہ الرحمۃ) — — — — — — ۴۳

۹۔ مولانا حافظ غلام مرشدؒ (دین الحق قاضی صاحب) — — — — — ۵۴

۱۰۔ مطالب الفرقان (علامہ پرویز علیہ الرحمۃ) قسطِ اوّل) — — — — ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت : ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ایبک روڈ لاہور

لمعات

مجوزہ شریعت بل میں نئی ترمیم

پچھلے سال سینٹ میں شریعت بل مجریہ ۱۹۸۵ء پیش کیا گیا تھا جسے سینٹ نے اس سال کے شروع میں رائے عامہ کے لئے مشتہر کر دیا تھا۔ طلوع اسلام کے مارچ ۱۹۸۶ء کے شمارے میں اس مجوزہ بل پر تبصرہ کیا جا چکا ہے اور مختلف فرقوں کے علماء کی جانب سے اس بل کی جو مخالفت کی گئی تھی اسے ان علماء ہی کی زبانی طلوعِ اسلام کے مستقل عنوان "حقائق و عبر" کے تحت پیش کیا جاتا رہا ہے۔ یہ مخالفت دن بدن بڑھتی ہی چلی گئی اور آخر الامر بل کو پیش کرنے والوں نے محسوس کر لیا کہ یہ بل موجودہ شکل میں پاس نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس بل کو قابلِ قبول بنانے کے لئے، حال ہی میں ان کی جانب سے کچھ نئی ترمیمات پیش کی گئی ہیں۔ ان ترمیمات کی تفصیلات روزنامہ جنگ لاہور کی ۶ ستمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں شائع ہو چکی ہیں۔ آئندہ سطور میں ان نئی ترمیمات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

مجوزہ شریعت بل کی سب سے اہم دفعات یا شقیں، شق نمبر ۲ اور شق نمبر ۱۲ ہیں۔ اور علماء کی جانب سے زیادہ تر انہی شقوں پر اعتراضات اٹھائے گئے ہیں۔ ان شقوں میں شریعتِ اسلامی کے ماخذ قرآن اور سنت بیان کئے گئے ہیں۔ اب قرآنِ مجید کے بارے میں تو یقین سے کہا جاتا ہے کہ یہ وہ کتابِ عظیم ہے جس پہ مسلمانوں کے سب فرقوں کا کامل اتفاق ہے اور جب ہی قرآنِ مجید کا نام لیا جاتا ہے تو ہر جگہ اس سے مراد وہ کتاب لی جاتی ہے جس کی ابتداء "الحمد" سے ہوتی ہے اور وہ "الناس" پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن سنت کے بارے میں ایسا اتفاق موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلعم نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کروا کے امتِ مسلمہ کے لئے نہیں چھوڑا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر فرقے کا اپنا اپنا مجموعہ حدیث ہے۔ ان مجموعوں میں کافی اختلاف ہے جس کی جھلک آئندہ سطور میں قارئین کے سامنے لائی جائے گی، لیکن عملی مشکل یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے مجموعہ حدیث کو تو صحیح قرار دیتا ہے اور دوسرے فرقوں کے مجموعہ ہائے احادیث کو ضعیف قرار دیتا ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سنت کا نام لیا جائے تو اس کے تعین کے لئے کونسا مجموعہ حدیث صحیح تسلیم کیا جائے گا۔

اس وقت ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی مشکل ہے۔ چنانچہ اس مشکل پر قابو پانے کے لئے مجوزہ شریعت بل کی دفعات ۲ اور ۱۲ میں یہ تصریح کی گئی کہ قرآن وسنّت کی وہی تعبیر معتبر سمجھی جائے گی جو اہلِ بیتِ عظام، صحابہ کرام اور امتِ مسلمہ کے مجتہدین اور شریعت اسلامی کے مسلمہ قواعد کے مطابق ہوگی۔

ہم نے مارچ ۱۹۸۶ء کے طلوعِ اسلام میں ایک مثال سے واضح کیا تھا کہ سنّت کی یہ تعریف صرف الفاظ کی حد تک کی گئی اور جن حضرات نے اسے پیش کیا ہے وہ خود اسے تسلیم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ بلکہ اس کے ذریعے کچھ لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور مجوزہ شریعت بل میں سنّت کی جو تعریف بیان کی گئی ہے۔ یہ حضرات اس وقت بھی عملاً اس کی بھرپور مخالفت کر رہے ہیں۔ یہ مثال تھی ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینا۔ طلاق کا یہ طریقہ سب کے نزدیک قرآن وسنّت کے خلاف ہے۔ لیکن حنفی فقہاء نے بعض مصلحتوں کی بناء پر اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا۔ تاہم چونکہ وہ خود اس طریقے کو، قرآن وسنّت کے خلاف تسلیم کرتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے طلاقِ بدعت کا نام دیا۔ دراصل اس فتویٰ کے ذریعے برسرِ اقتدار طبقے کی ایک ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس لئے جو طبقات جن میں جعفری فقہ کے پیروکار پیش پیش تھے، نے اس طلاقِ بدعت کو قرآن وسنّت کے خلاف ایک لغو فعل قرار دے کر اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسے علماء جو اپنے آپ کو احادیث تک محدود رکھتے تھے اور فقہا کے اجتہاد کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ایک حدیث کے حوالے سے طلاق کے اس طریقے کو قرآن وسنت کے ساتھ ایک مذاق قرار دیا، ہمارے ملک میں اس مسلک والے لوگوں کو اہلحدیث کہا جاتا ہے۔ طلاقِ بدعت کے بارے میں مودودی صاحب کی بھی شروع شروع میں یہی رائے تھی۔ وہ اسے قرآن وسنت کے خلاف ایک مذاق قرار دیتے تھے ملاحظہ ہو ان کی کتاب حقوق الزوجین۔

اس طلاقِ بدعت کو عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء میں ختم کیا جا چکا ہے۔ اور اس کی بجائے طلاقِ سنّت کو رائج کیا جا چکا ہے۔ اگر یہ حضرات اپنے مجوزہ شریعت بل کے بارے میں مخلص ہوتے تو پھر وہ طلاقِ بدعت کو دوبارہ رائج کرانے کے لئے جدوجہد نہ کرتے، کیونکہ اس کی بجائے طلاق کے جس طریقے کو ملک میں رائج کیا جا چکا ہے وہ ائمہ اہلِ بیت عظام، صحابہ کرامؓ اور شریعتِ اسلامی کے مسلمہ قواعد کے عین مطابق ہے۔ اس لئے ان حضرات کو بار بار یہ کہا گیا ہے کہ مجوزہ شریعت بل میں انہوں نے سنّت کی جو تعریف متعین کی ہے اسے وہ خود ہی عملاً تسلیم نہیں کرتے تو امّت مسلمہ کے ساتھ یہ فراڈ کیوں کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس صورتِ حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اور اس قسم کے اعتراضات سے بچنے کے لئے انہوں نے سنّت کی تعریف کے سلسلے میں مجوزہ شرعی بل کی عبارت میں یہ تبدیلی کی ہے:-

شق نمبر ۲ ؛ تعریف ، اس ایکٹ میں شریعت سے مراد :۔
(الف) دین کا وہ خاص طریقہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اپنے بندوں کے لئے مقرر کیا ہے۔
(ب) شریعت کا اصل ماخذ قرآن پاک اور سنت رسول ہے ،
(ج) کوئی حکم یا ضابطہ ، جو اجماعِ امت سے ثابت اور ماخوذ ہو ، شریعت کا حکم متصور ہوگا۔
(د) ایسے احکام جو امت مسلمہ اور مستند فقہاء (مجتہدین) نے قرآنِ پاک ، سنت رسول اور اجماعِ امت سے قیاس اور اجتہاد کے ذریعے مستنبط کر کے مدون کئے ہیں ، شریعت کے احکام متصور ہوں گے۔

پھر آگے تعریفات کے ضمن میں شق (ج) میں یہ توضیح کی گئی ہے کہ قرآن و سنت کے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے ، درج ذیل ماخذ سے رہنمائی حاصل کی جائے گی۔

(۱) سنتِ خلفائے راشدین
(۲) تعاملِ اہلِ بیتِ عظام و صحابہ کرام
(۳) اجماعِ امت
(۴) مسلمہ فقہائے اسلام کی تشریحات اور آراء

(روزنامہ جنگ بابت ۶ ستمبر ۱۹۸۶ء)

ان ترمیمات کے مجوزین میں ایک صاحب حافظ عبدالرحمٰن مدنی رابطہ علمائے اہلِ حدیث پاکستان کے بھی دستخط ہیں ، معلوم نہیں اہلحدیث فرقے میں اس کی کیا حیثیت ہے ، اس نے اس ترمیم شدہ تعریف میں عملاً اس فیصلے پر دستخط کر دیئے ہیں کہ اس ملک میں چونکہ حنفی فقہ کے پیروکاروں کی اکثریت ہے اس لئے یہاں حنفی فقہ رائج ہونا چاہیئے ۔کیونکہ اس ترمیم شدہ دفعہ ۲ کی شق (د) میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو احکام امت مسلمہ کے مسلمہ اور مستند فقہاء نے قرآن پاک ، سنت رسول اور اجماع امت کے قیاس اور اجتہاد کے ذریعے مستنبط کر کے مدون کئے ہیں ، شریعت کے احکام متصور ہوں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس اہلحدیث مولوی نے ان ترمیمات پر دستخط کئے ہیں وہ کوئی نیم تعلیمیافتہ شخص تھا کہ جسے حنفی فقہ کی اصطلاحی تعریف کا بھی علم نہیں تھا ۔ اوپر شق "د" میں جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ حنفی فقہ کی اصطلاحی تعریف ہے اس لئے تو کسی ــــــ معمولی شیعہ عالمِ دین نے ان نئی ترمیمات کی تائید کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

مجوزہ شرعی بل کی دوسری اہم شق نمبر ۵ ہے جو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار کی بابت ہے ، اس بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار سماعت و فیصلہ بلا استثنیٰ تمام امور و مقدمات پر حاوی ہوگا۔ اس شق کے بارے میں کوئی نئی ترمیم نہیں کی گئی بلکہ یہ واضح

کیا گیا ہے کہ اس شق کو بدستور قائم رکھا جائے تاہم اسے موثر بنانے کے لئے دستور کے آرٹیکل ۲۰۳-بی میں مناسب ترمیم کی ضرورت ہے۔ (ایضاً)

آئین کی اس دفعہ کے تحت دو امور کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار سے باہر رکھا گیا تھا ایک عائلی قوانین اور دوسرے مالی معاملات۔ اس سلسلے میں آئین میں آٹھویں ترمیم کے ذریعے حال ہی میں یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ عائلی قوانین کو تو مکمل طور پر وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار کے تحت لایا جائے ـــ جب کہ مالی امور کے بارے میں وہ فیصلہ تو نہیں کر سکتی البتہ اس کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے بارے میں مقننہ سے اس سلسلے میں سفارش کر سکتی ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے بارے میں ہمارے علماء کا طرزِ عمل عجیب ہے۔ انہیں اس عدالت کے صرف ان فیصلوں سے دلچسپی ہے۔ جن کا ان کی ذات سے تعلق ہو، اس کے برعکس وفاقی شرعی عدالت کے جن فیصلوں کا تعلق لاکھوں انسانوں کی بہبود سے ہو، انہیں ان فیصلوں سے مطلق کوئی سروکار نہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ پہلے وفاقی شرعی عدالت نے یہ شاندار فیصلہ دیا تھا کہ گھوڑ دوڑ پر جو شرطیں لگائی جاتی ہیں۔ وہ جواء کی تعریف کے ذیل میں آتی ہیں، اور شرعاً حرام ہیں لیکن اخباری اطلاعات کے مطابق شرعی عدالت کے اس فیصلے کے باوجود، جوئے کا یہ کاروبار جاری رہا اور عوام کی جانب سے اس کے خلاف وقتاً فوقتاً احتجاج بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عوام کے اس احتجاج کے جواب میں، پولیس کی جانب سے اعلان کیا گیا ہے کہ جوئے کے اس مبینہ کاروبار کے خلاف جلد ہی کارروائی کی جائے گی۔ آج مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۸۶ء کے اخبارات میں پولیس کا اعلان اس سرخی کے ساتھ شائع ہوا ہے کہ ریس کلب کا بھی محاسبہ کیا جائے گا اور اس کے نیچے یہ تفصیل دی گئی ہے :-

ایس ایس پی لاہور رانا مقبول احمد نے کہا ہے کہ وہ لاہور ریس کلب میں ہونے والے مبینہ جوئے کے خلاف کارروائی کریں گے۔ انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ انہیں اطلاع ملی ہے کہ ریس کلب میں ہر ریس (گھوڑ دوڑ) پر لاکھوں روپے کا جوا ہوتا ہے۔ بک میکروں نے گھوڑوں کے ریٹ لگا رکھے ہیں اور وہ شرطیں لگانے والوں کو باقاعدہ کارڈ جاری کرتے ہیں، انہوں نے کہا کہ لاہور پولیس، جرائم کے بارے میں کسی سے رعایت نہیں برتے گی اور ریس کلب کا بھی محاسبہ کیا جائے گا۔"

(روزنامہ امروز لاہور بابت ۱۳ ستمبر ۱۹۸۶ء)

لیکن حیرت کی بات ہے کہ عوام کی جانب سے وقتاً فوقتاً احتجاج کے باوجود، ہمارے علماء میں سے کسی نے بھی، وفاقی شرعی عدالت کے اس شاندار فیصلے کا کبھی نوٹس تک نہیں لیا۔ اور فیصلے کے باوجود مبینہ طور پر جوئے کا جو کاروبار کھلے عام جاری رہا، اس کے خلاف انہوں نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ بعض علماء نے وفاقی شرعی عدالت میں اس مقدمے میں یہ دلائل

دیئے تھے کہ گھوڑ دوڑ پر جو شرطیں لگائی جاتی ہیں وہ جوئے کے ذیل میں نہیں آتیں۔ اسلئے جائز ہیں اور اسی بنا پر انہوں نے شرعی عدالت کے اس فیصلے کا کوئی خیر مقدم نہیں کیا۔ اگر معاملہ واقعی ایسا ہے تو پھر ایسے حضرات کا طرزِ عمل اور زیادہ افسوسناک ہے۔

ان گزارشات سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ملکِ عزیز میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے سب سے ضروری امر یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر صدق دلی سے عمل کیا جائے صرف قانون پاس کروانے سے اسلام نافذ نہیں ہوگا اور اس کا کسی حد تک تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ ہمارا اشارہ حدود آرڈیننس اور دوسرے ایسے قوانین کی طرف ہے کہ ان قوانین کے نفاذ کے باوجود، ہمارے معاشرے سے زناکاری اور چوری کے جرائم کا خاتمہ ہونا تو کجا، الٹا ان میں اضافہ ہو چکا ہے۔ خود وہ حضرات جو مجوزہ شریعت بل پاس کروانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں بلکہ اس سلسلے میں انہوں نے ممبران اسمبلی کو یہ کہہ کر بھی ڈرایا ہے کہ اگر انہوں نے مجوزہ شریعت بل پاس نہ کیا، تو اس ملک پر قہرِ الٰہی نازل ہو جائے گا، وہ خود شریعت کے ایسے احکامات، جو ان کے مجوزہ شرعی بل کے مطابق ہمارے معاشرے میں مروج بعض معاملات کو حرام قرار دیتے ہیں، کو تسلیم نہیں کرتے اور ان حرام معاملات کو ترک کرنے پر تیار نہیں۔ اس سلسلے میں اگرچہ بہت سے مسائل کا حوالہ دیا جا سکتا ہے لیکن ہم صرف ایک مسئلہ کی مثال پر اکتفا کرتے ہیں اور وہ مسئلہ بھی ایسا ہے کہ جسے وہ خود اپنی زبان سے حرام قرار دے چکے ہیں۔

اس مسئلہ کی تفصیلات یہ ہیں کہ ۱۹۷۷ء میں جو قومی اتحاد معرضِ وجود میں آیا تھا، اس میں تمام فرقوں کے علماء شامل تھے ان میں بریلوی بھی تھے، دیوبندی بھی تھے، اہلحدیث بھی تھے اور جماعتِ اسلامی والے بھی۔ اس قومی اتحاد نے اپنا ایک منشور جاری کیا جس کے صفحہ ۱۶ پر یہ اعلان کیا گیا کہ غیر حاضر زمینداری کا نظام شریعتِ اسلامی کے خلاف ہے، دوسرے الفاظ میں زمین اسی کی ہونی چاہیئے، جو اس میں ہل چلائے اور محنت کرے۔ چنانچہ اس نظام کو خلافِ شریعت قرار دینے کے بعد، یہ وعدہ کیا گیا کہ جب قومی اتحاد برسرِ اقتدار آئے گا تو وہ زمین اسی کے پاس رہنے دے گا جو اس پر عملاً کام کرے گا، دوسرے الفاظ میں غیر حاضر زمینداری کے نظام کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

قومی اتحاد کا یہ منشور تمام قومی اخبارات میں بھی چھاپا گیا اور اس کی لاکھوں نقول عوام میں تقسیم کی گئیں لیکن اس وقت کسی عالمِ دین نے اس کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا، فقہی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس پر اجماعِ امت ہو گیا۔ جسے اب مجوزہ شریعت بل میں اسلامی قانون کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ لیکن اس اسلامی قانون سے، مجوزہ شریعت بل پیش کرنے والوں نے کیا سلوک کیا۔ قومی اتحاد کی تحریک کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہو گئی تو قومی اتحاد میں شامل تقریباً تمام دینی جماعتوں کو نئی حکومت میں شامل کیا گیا۔ لیکن حکومت

ہیں شامل ہونے کے بعد، بتمام جماعتیں، غیر حاضر زمینداری کے خاتمے کے بارے میں اپنے اعلان کو جو عملاً اجماعِ امت کا مقام حاصل کر چکا تھا بھول گئیں صرف بھول ہی نہیں گئیں بلکہ انہوں نے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اب ان تمام جماعتوں نے اس بارے میں اپنا مسلک تبدیل کر کے غیر حاضر زمینداری کے نظام کو دوبارہ جائز قرار دے دیا۔

جب ایسے اجماع امت کے بارے میں کہ جس کے عینی گواہ ابھی تک کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، ان کا طرزِ عمل یہ ہے، تو دوسرے مسائل کے بارے میں یہ کیا کچھ نہیں کریں گے۔ اور آخر میں پھر ہم اپنے تجزیئے کو دہرائیں گے کہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے ضروری ہے کہ ہم قرآنِ کریم پر مبنی اسلامی تعلیمات پر صدق دلی سے عمل کریں چاہے اس سے ہمیں کتنا ہی ذاتی نقصان کیوں نہ ہو۔ صرف قوانین پاس کرانے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتے ہاں اس طرزِ عمل سے عامۃ الناس کو کچھ مزید عرصے کے لئے گمراہ کیا جا سکے گا۔

ایک اور گرانقدر و دردمند رفیق کی جدائی!

۱۳ ستمبر ۸۶ء کو محترم مقبول محمود فرحت صاحب بزمِ طلوعِ اسلام لندن کے سابقون الاولون کی طرف سے ایک ایمرجنسی پروگرام بنام شیخ عبدالحمید صاحب سیکرٹری ادارہ طلوع اسلام یہ روح فرسا خبر لایا کہ بزمِ لندن کے نمائندہ محترم مقصود حسین کیانی صاحب کا ۴۲ دن کی علالت کے بعد سوموار نصف شب یکم ستمبر کو انتقال ہو گیا۔

کیانی صاحب سالہا سال سے بزمِ طلوعِ اسلام لندن کی نمائندگی کے فرائض نہایت کامیابی سے سرانجام دے رہے تھے۔ انہیں قرآنی فکر کے ساتھ بیحد گہرا لگاؤ تھا۔ اور ان کی نمائندگی میں بزمِ لندن (سارے یورپ میں) اس جہت سے کہ مغربی ممالک میں لندن کو جو مقام حاصل ہے۔ کیانی صاحب تحریک کی بے لوث خدمت انجام دے رہے تھے۔ بزمِ لندن کے لئے کیانی صاحب کی وفات سے جو خلا واقع ہوا ہے اسے پورا کرنا بہت دشوار ہوگا۔ گذشتہ اکتوبر ۸۵ء میں ان کا تحقیقت کتا مقالہ "قرآنی اسلام کیا ہے"؟ (فکر پرویز کی روشنی میں) طلوع میں شائع ہوا تھا، جس میں قرآنی حقائق کا ملخص صرف چند صفحات میں پیش کر دیا گیا تھا۔

ادارہ طلوعِ اسلام کے احباب اللہ تعالےٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ کیانی صاحب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور انہیں اور ان کے پسماندگان کو اپنے سحابِ کرم میں رکھے۔

والسلام۔ منجانب (ایم ایم خلیل)

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵۔بی گلبرگ ۲۔ لاہور

قرآن کا پیغام

دینِ اسلام سے عوام الناس کو روشناس کرانے اور قرآن حکیم کے ازلی و ابدی پیغام کو عام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جو لوگ امورِ دین کو جانتے اور حقائقِ قرآنی کا علم رکھتے ہیں وہ اس کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو نہیں جانتے کہ قرآنِ کریم انسانی زندگی کی راہنمائی کس طرح کرتا ہے اور دین کا مطالبہ کیا ہے؟ ابلاغِ قرآن کا یہ طریقہ تبلیغِ اسلام یا دعوتِ دین کہلاتا ہے۔ ایک مسلمان کا یہ بڑا اہم فریضہ ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو خالصتاً قرآن کا پیغام عام کرتا رہے۔ یعنی اس کے عطا کردہ احکامات و قوانین اور اقدار و ضوابط کی تبلیغ کرتا رہے تاکہ لوگوں کو حق کے راستے پر آنے کی تحریک پیدا ہو۔ اور وہ اس دعوت کو سمجھ کر غور و فکر کے بعد اسے دل و دماغ کی رضامندی کے ساتھ قبول کرکے دینِ اسلام کو قولاً و فعلاً اختیار کریں اور دین کی تعلیم یعنی احکام و انداز قرآنی کے پابند ہوں۔ یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیئے کہ تبلیغِ اسلام کی ضرورت غیر مسلموں کے لئے ہی نہیں ہوتی۔ بدقسمتی سے خود مسلمانوں کی کثیر الکثیر تعداد ہمارے درمیان ایسی موجود ہے جو قرآنِ مجید کے مطالب و مفاہیم سے بالکل نابلد و ناآشنا ہے، ماسوا اس کے کہ ان میں سے کچھ لوگ ناظرہ قرآن پڑھنا جانتے ہیں، مگر صرف قرآن کے الفاظ دہرا لینے سے اس کی تعلیم سے آگاہی تو نہیں ہو جاتی۔ مسلمان ہوتے ہوئے دین کی حقیقی تعلیم سے آگاہ ہونا لازم ہے، دینِ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کے نام لیواؤں پر زیادہ سے زیادہ قرآن کی صداقتیں روشن ہوں۔ چنانچہ اس کے لئے داعیان الی الحق اور قرآنِ پاک پر عبور رکھنے والوں کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ تعلیمِ دین کی ذمہ داری کو بجا لانے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ علاوہ ازیں قرآن کے پیغام کو عام کرنے کے لئے یہ دیکھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ کونسا طریق اس دعوتِ دین کو زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز بنا سکتا ہے۔ قرآن خود ہمیں اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اپنے خدا کے راستے کی طرف حکمت اور موعظتِ حسنہ کے ساتھ دعوت دیتے چلے جاؤ۔ مراد اس سے یہ ہے کہ دین کی طرف راغب کرنے اور قرآنی تعلیم کا پابند بنانے کے لئے حکمت و موعظت سے کام لینا ہوگا۔ حکمت اور موعظت کی تشریح قرآن کے حوالے سے یوں ہوگی

کہ ہر قانون کوئی غرض و غایت، کوئی مقصود، کوئی سبب رکھتا ہے یعنی یہ بتایا جائے کہ ایسا قانون کیوں دیا گیا۔ اسی کا نام حکمت ہے۔ جیسا کہ قرآن نے روزہ کا قانون دیا ہے یہ کہہ کر:
كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تم پر روزے فرض کئے گئے اور اس قانون کی حکمت یہ بتائی ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۲/۱۸۳) تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ زندگی کے خطرات سے محفوظ رہو۔ حکمت کے معنی دلیل و حجت کے بھی آتے ہیں۔ یہ اعتبارِ غرض و غایت اور علت و مقصود کے۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جو کام کریں عقل و فکر کی رُو سے سوچ سمجھ کر کریں۔ اس دانائی اور ہوشمندی کی صلاحیت کو بھی حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس بناء پر دین کی دعوت دینے والے اور قرآن کی طرف بُلانے والے حکمت کو اس طرح ملحوظ رکھیں گے کہ قرآن کے کسی حُکم۔ قدر۔ قانون کو عام کرتے ہوئے، اس کی غرض و غایت اور اس کا مقصود بھی بیان کریں گے جس کی وضاحت قرآنِ کریم نے ساتھ کے ساتھ کر دی ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ عقل و فکر سے کام لیتے ہوئے دلیل و برہان کے ساتھ دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کریں گے تاکہ سننے والوں کے قلب و ذہن میں کسی قسم کا شک و شبہ پیدا نہ ہو۔ اور وہ بطیبِ خاطر حکمِ خداوندی کے مطابق ایمان لاتے ہوئے، دل کی کشاد کے ساتھ دینِ اسلام سے وابستہ رہیں۔ حکمت کے ساتھ دوسری چیز موعظت یعنی نصیحت ہے جو دعوتِ دین کے سلسلے میں اپنا خصوصی مقام رکھتی ہے۔ قرآن نے موعظت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے بنیادی معنی چارہ سازی اور خیر اندیشی کے ہیں۔ یعنی جب کسی کو اچھی روش اختیار کرنے کے لئے کہا جائے تو اس میں سننے والے کا اپنا کوئی مفاد نہ ہو۔ کہ نصیحت وہی ہوتی ہے جس کا محرک جذبہ دوسرے کی خیر خواہی ہو۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ نصیحت کرنے والوں کے دل اس پاکیزہ اور تعمیری جذبے سے مامور ہوں کہ گمراہ اور بے خبر لوگ اُس تباہی سے بچ جائیں جو غلط روش کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن کا پیغام ان کے دلوں میں اتارنے کے لئے نرمی اور ملائمت سے گفتگو کرنے کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔ اس کے ساتھ خیر خواہی کا ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ اصول و اقدارِ قرآنی کی ہر بات ان کا دل قبول کرتا چلا جائے۔ یہی طریقۂ کار نصیحت کو مؤثر بناتا ہے۔ اور سب سے زیادہ کارگر نصیحت تو وہی ہوتی ہے جو اپنے عملی نمونے سے پیش کی جاتی ہے۔ یہی موعظتِ حسنہ ہے۔ اسی سلسلے میں قرآن میں آیا ہے کہ اس شخص کی بات سے زیادہ حسین اور جاذب بات کس کی ہو سکتی ہے جو لوگوں کو قانونِ خداوندی کی طرف دعوت دیتا ہے اور خود خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ یوں وہ اپنی عملی زندگی سے ثابت کر دیتا ہے کہ وہ ان میں سے ہے جو قوانینِ خداوندی کے اطاعت گزار یعنی مسلمان ہیں۔ اس فرمانِ ربّی سے یہ مستقل اصول بھی سامنے آیا کہ معاشرے میں قرآن کا پیغام عام کرنے والوں پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ خود تعلیمِ قرآنی کو نہ صرف جانتے ہوں بلکہ عملی طور پر اس کے پابند بھی ہوں۔ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکے ہوئے۔ اعمالِ صالحہ کے حامل لوگوں کی دعوتِ دین یا تبلیغِ اسلام، حکمت و موعظت کے ساتھ کی جانے والی، دلوں پر لگے

بند تالوں کو کھول دیتی ہے۔ اور منجمد ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

قرآن کے فرمان کے مطابق دین کے تعلق سے حکمت کے ساتھ نصیحت کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ کوئی شخص اس وجہ سے تباہ نہ ہو جائے کہ اُس تک قرآن کا پیغام پہنچا ہی نہیں۔ صحیح بات اُسے بتائی ہی نہیں گئی۔ اس لئے وہ غلط کام ہی کرتا رہا۔ یا اسے راہِ ہدایت دکھائی ہی نہیں گئی جو وہ اسطرف آتا۔ قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصے میں بتایا گیا ہے کہ جب انہیں اپنے بھائی ہارون کے ساتھ فرعون کی طرف قوانینِ خداوندی جانے اور دعوتِ دین دینے کا حکم ہوا تو ان سے کہا گیا کہ جب اس کی طرف جاؤ تو اس سے نرمی سے بات کرنا ہو سکتا ہے کہ وہ اس طرح نصیحت پکڑ لے۔ یا اپنی سرکشی کے انجام سے ڈر جائے۔ اس ہدایتِ قرآنی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نرمی سے کی گئی نصیحت سرکش لوگوں کو بھی غور کرنے پہ مائل کر سکتی ہے اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن اس کی نشان دہی بھی کرتا ہے کہ تبلیغ کے لئے سینے کی کشاد، زبان کی طاقت اور ایسا اسلوبِ بیان جس سے بات دوسروں کی سمجھ میں آ جائے، بہت اہم ہے۔

کوئی بات سمجھ میں اُسی وقت آتی ہے جب سمجھانے والا اخلاصِ نیت اور صدقِ دل کے ساتھ اس حُسنِ کارانہ انداز سے نصیحت کرے کہ سننے والے کی تمام تر توجہ اسی کی طرف مبذول ہو اور پھر اس کے دل میں دعوتِ حق قبول کرنے کی خواہش از خود ابھرے۔ برعکس اس کے ہم عام طور پہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر واعظین مساجد وغیرہ میں جب مجمع کو خطاب کرتے ہیں اور انہیں دعوتِ دین دینا چاہتے ہیں تو ایسے تند و تیز لہجہ میں بے جا جوش و خروش کے ساتھ دینی مسائل کو پیش کرتے ہیں کہ ان کے الفاظ جبر و اکراہ کی تصویر بن کر اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں۔ اور تعلیم قرآنی کے سلسلے میں نصیحت کرنے کا سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ کوئی اچھی بات سختی سے یا لڑ جھگڑ کر نہیں منوائی جاتی۔ نہ ہی دوسرے کی رضامندی کے بغیر کوئی عقیدہ کسی پہ ٹھونسا جا سکتا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ دینِ اسلام اختیار کرنے میں کسی زبردستی، زیادتی کا قطعاً دخل گزر نہیں۔ قرآن کا یہ اعلان ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: اسلامی سوسائٹی کا رکن دل کی رضامندی سے بنا جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم ہر بات حکمت و دلیل سے پیش کرتا اور دل و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد منواتا ہے۔ قرآن کی طرف دعوت دینے والوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اس کی حقیقی تعلیم کو اُسی طرزِ عمل کے ساتھ معاشرے میں عام کریں۔ جس کی ہدایت ہمیں اسی کتابِ مبین سے عطا ہوئی ہے، جو خود حکمت والی ہے اور جس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ اسی حکمت کو سمجھنے اور سمجھانے پہ دعوتِ دین کی قبولیت اور احکامِ خداوندی کی بجا آوری کا دارومدار ہے۔ اور اسی حکمت پہ مبنی نصیحت دلوں میں وہ انقلاب پیدا کرتی ہے جو کہ دینِ اسلام کی غرض و غایت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ناصحانِ قوم اپنی ذات میں مخلص اور سچے ہوں اور اپنے اقوال کی صداقت

اعمال کی صورت میں پیش کرتے رہیں تو یہ ان سب سے بڑی نصیحت ہے جو اثر کئے بغیر نہیں رہتی تاریخِ اسلام کے اوراق ایسی سینکڑوں عملی مثالوں سے مزین ہیں کہ رہروانِ حق نے اپنے کردارِ عالیہ سے مخالفینِ دین کے قلوب کو یکسر بدل ڈالا۔ اور وہ لبیک کہتے ہوئے دینِ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ روشن، ترین زندہ و پائندہ مثال تو اس ذاتِ اقدس و اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جس کے متعلق یہ فرمانِ ربی ہوا۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱) "بلا شک و شبہ رسولؐ کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے"۔ وہ ذات بابرکات اخلاق و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ خداوندی کے مطابق بندگانِ خدا کو کتاب اللہ کی حکمت کے ساتھ تعلیم دی اور اپنے اخلاق و کردار سے دعوتِ دین کو کامیاب ترین بنایا۔ ہم رسولِ کریمؐ کے نام لیواؤں کو اسی روشِ قدسیہ کی صحیح پیروی کرنے سے ہی فوز و فلاح حاصل ہو سکتی ہے۔

(ثریا عندلیب)

(بقیہ مولانا غلام مرشد)

محکمہ کے سربراہ نے سبکدوشی کا کلہاڑا انہی پہ چلا یا۔ (مغربی پاکستان کے گورنر نواب کالاباغ کے زمانہ میں) بعد میں حکومت نے ان کی علمی خدمات کے پیشِ نظر صرف ۵۰۰ روپیہ کی قلیل سی رقم بطور الاؤنس مقرر کردی۔ جو سابقہ حکومت (دورِ بھٹو) یا موجودہ حکومت (جرنیل ضیاء الحق کی مارشل لاء حکومت) نے بند کر دی۔ یہاں تک کہ اس مردِ مجاہد کا ۱۹/۲۰ ستمبر ۱۹۷۹ء کو انتقال ہو گیا اور قرآن کریم کا شیدائی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ جانتے ہو۔ کون تھا!

مولانا حافظ غلام مرشدؒ

جس نے اپنے نصف صدی کے درس و تدریس کے دوران کبھی مشاہرہ قبول نہ کیا۔ البتہ الاؤنس قبول کیا اور ہر طرح کی مخالفت کے علی الرغم درسِ قرآن کو جاری رکھا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اے لاہور شہر کے باسیو! اے اونچی مسجد کے قرب و جوار کے مکینو! اے سنہری مسجد میں حاضری دینے والو! اے بادشاہی مسجد لاہور میں نماز پڑھنے والو! کیا آپ اس مجاہد کو بھول گئے۔ فراموش کر بیٹھے۔ جو تقریباً نصف صدی تمہارے کانوں تک آوازِ قرآن پہنچاتا رہا۔

اے انجمن حمایت اسلام لاہور کے معزز اراکین! آپ کا سالانہ جلسہ اُن کی آوازِ حق سے گونجتا تھا۔ آپ سب خاموش کیوں ہو گئے؟ اُس مردِ حق آگاہ کی یاد میں کوئی لائبریری، ہسپتال، دینی مدرسہ کوئی لاوارث گھر وغیرہ بنا کر یادگار بھی قائم نہ کر سکے!!!

(دین الحق قاضی)

ایک سنّتِ رسولؐ کی بے حُرمتی پر عُلماء کی خاموشی!

عائلی قوانین کے خلاف، ہمارے علماء کا احتجاج پچھلے پچیس سال سے جاری ہے۔ وہ مساجد میں بھی ان قوانین کے خلاف تقریریں کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً ان کے بیانات بھی اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات، جن میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سرِفہرست ہیں، نے عائلی قوانین کی مخالفت کو اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا ہے۔ ان کی دھواں دار تقریر سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شائد عائلی قوانین اسلام کے خلاف کوئی گھناؤنی سازش ہے۔ حالانکہ طلوع اسلام کے صفحات پر کئی دفعہ واضح کیا جا چکا ہے کہ عائلی قوانین میں کچھ بھی خلافِ اسلام نہیں بلکہ کسی زمانے میں ہمارے علماء خود اس قسم کے قوانین کی، اس ملک میں نفاذ کی خواہش کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

اس کی تائید میں طلوع اسلام میں عائلی قوانین اور مودودی صاحب کی کتاب "حقوق الزوجین" کا تقابلی مطالعہ کئی دفعہ پیش کیا جا چکا ہے کہ ان دونوں کی اصل ایک ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کئی سال تک جماعت اسلامی کے رکن رہے۔ انہیں مودودی صاحب کی "حقوق الزوجین" تو خلافِ اسلام نظر نہ آئی۔ لیکن جب عائلی قوانین جن کی یہ کتاب ہو بہو نقل ہے کو ملک میں نافذ کیا گیا تو یہ ان قوانین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

عائلی قوانین کے بارے میں ان کے اس طرزِ عمل سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ان کی مخالفت کر کے اپنی سیاست کو چمکانا چاہتے ہیں۔ بہرحال ہی میں عائلی زندگی کے سلسلے میں ایک سنّتِ رسولؐ کی (معاذ اللہ) سخت بے حُرمتی ہوئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر اسرار احمد سمیت کسی عالم دین نے اس کے خلاف ایک لفظ تک اپنے منہ سے نہیں نکالا۔ اس بے حُرمتی کے واقعہ کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔

قومی اخبارات نے اپنی دس اگست ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں ایک ایسی خبر کی تفصیلات شائع کی ہیں، جس نے تمام اہل ضمیر مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس خبر کے مطابق، گوجرانوالہ کے ایک پروفیسر صاحب کی لڑکی کی شادی تھی۔ جس کے لئے بارات گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں اتری۔ لیکن جب نکاح ہونے لگا تو دولھا نے جہیز میں صرف تین تولے طلائی زیورات اور جہیز کی کمی پر اعتراض کیا اور جب جیب خرچ کے طور پر ایک ہزار روپیہ نکاح فارم میں لکھا جانے لگا تو اس نے احتجاج کرتے ہوئے نکاح فارم پھاڑ دیا۔ اور کار میں بیٹھ گیا۔ دولھا کے والدین، بہنوں اور دیگر براتیوں نے اس کی بہت منت سماجت کی اور دلہن کے والدین نے اس کے تمام مطالبات پورے کرنے کی حامی بھر لی۔ مگر وہ ان تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دوڑ گیا۔ جب اس کی اطلاع

دلہن کو ملی تو وہ بے ہوش ہوگئی۔ کئی دن تک اس پر بے ہوشی کی کیفیت طاری رہی۔ اور اس کی والدہ کو سکتہ لاحق ہو گیا ہے۔

یہ واقعہ اس دردناک حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں شادی اب سنتِ رسول کی بجائے ایک کاروبار کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ مذکورہ بالا واقعہ میں دولہا کا طرزِ عمل سنتِ رسول کی توہین کے مترادف ہے۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ ہمارے علماء، دولہا کی اس غیر اسلامی حرکت کا نوٹس لے کر، اس کی مذمت کریں گے۔ لیکن پورا ایک ماہ گزر چکا ہے۔ لیکن کسی عالم دین نے سنتِ رسول کی اس بے حرمتی پر، اپنی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکالا۔

دراصل یہ واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں۔ بلکہ جب سے اس سنتِ رسول کو کاروبار میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔ اس قسم کے سینکڑوں واقعات، ہمارے معاشرے میں واقع ہوتے رہتے ہیں اور شادی جیسی متبرک سنت کی قیمت چکائی جاتی ہے۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ہمارے علماء اس غیر اسلامی طرزِ عمل کی مخالفت کی بجائے اس میں ہر طرح کا تعاون کرتے ہیں۔

شادی کے بارے میں اسلامی تعلیمات بڑی واضح ہیں۔ ان کے مطابق شادی کے تمام اخراجات کی ذمہ داری ہونے والے خاوند پر عائد ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ واضح ارشاد موجود ہے کہ اگر کوئی مرد شادی کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا، تو اسے شادی سے باز رہنا چاہیئے۔ اس قرآنی حکم کی تشریح رسول اللہ صلعم نے اپنی پیاری بیٹی، حضرت فاطمہؓ کی شادی کی عملی مثال سے واضح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے آپؐ کے گھر میں ہی پرورش پائی تھی اور آپؐ اگر چاہتے تو ان کی شادی کے اخراجات بھی پورے کر سکتے تھے۔ لیکن جب شادی کا وقت قریب آیا تو آپؐ نے حضرت علیؓ پر واضح فرما دیا کہ شادی کے تمام اخراجات انہوں نے برداشت کرنے ہیں۔

اس مقصد کے لئے حضرت علیؓ کے پاس خرچ کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ آپؓ کو اپنی زرہ بکتر ۴۸۰ درہم میں فروخت کرنی پڑی۔ آپ نے یہ رقم لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دی۔ جس سے گھر کا ضروری سامان اور دلہن کے کپڑے خریدے گئے۔ زیور صرف چاندی کے مہیا کیئے گئے۔

اسلام کی اس مثالی شادی کی تفصیلات سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ نئے گھر کا ضروری ساز و سامان جسے ہمارے ہاں جہیز کہا جاتا ہے۔ کے مہیا کرنے کی ذمہ داری، ہونے والے خاوند پر عائد ہوتی ہے۔ اور آج بھی عرب ممالک سمیت تمام اسلامی ممالک میں اسی پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن برصغیر ہند و پاک میں ہندو معاشرے میں، جہیز کی رسم بد کا رواج تھا اور مسلمانوں نے اسے اختیار کر لیا۔ لیکن اب تو خود ہندو اس کے بُرے اثرات کی وجہ سے چیخ اٹھے ہیں اور اس کے خلاف دن بدن قوانین کو سخت سے سخت تر بنائے جا رہے ہیں۔

اس سلسلے میں نئی دہلی کی اس خبر جو ۲۶ اگست ۸۶ء کے اخبارات میں چھپی ہے، کا حوالہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس خبر کے مطابق، بھارتی پارلیمنٹ نے، جہیز کے خلاف جو قانون پاس کیا ہے، اس کے تحت قید کی سزا، دو برس سے بڑھا کر پانچ برس کر دی گئی ہے۔ جبکہ جرمانے کی شرح بڑھا کر پندرہ ہزار روپے

کر دی گئی ہے۔ یاد رہے کہ گزشتہ برس ۱۰۷ دلہنوں کو جہیز کم یا نہ لانے پر قتل کر دیا گیا تھا۔ نئے قانون کے تحت ایسی کسی موت کی صورت میں شوہر کے گھر والوں کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ بے گناہ ہیں۔ اب دلہن کے جل جانے یا اس کی خودکشی کر لینے کی صورت میں سسرالی عزیزوں کی ضمانت نہیں ہو سکے گی۔ خواتین کے امور کے نائب وزیر مارگریٹ الوائے نے پارلیمنٹ کے ایوان بالا میں بتایا ہے کہ دیگر قوانین میں بھی تبدیلی کی جا رہی ہے تاکہ جہیز کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینے میں آسانی ہو۔

ہمارے ملک میں جہیز کی رسم بد کے اثرات کو حکومت اور عوام دونوں کی سطح پر محسوس کیا گیا۔ چنانچہ اس پر پابندی لگانے کے لئے ۱۹۷۶ء میں شادی اور جہیز کے اخراجات پر پابندی کا قانون پاس کیا گیا۔ اس قانون کے مطابق شادی کے اخراجات اور تحفوں کی مجموعی مالیت پانچ ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ اس رقم میں کسی سونے کے زیور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن آج شاید ہی کسی شادی میں اس قانون کی پابندی کی جاتی ہو۔ متوسط قسم کے گھرانوں کی شادیوں پر لاکھوں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ لیکن عائلی قوانین کی مخالفت کو اپنے ایمان کا حصہ قرار دینے والے علماء نے کبھی ان خلاف اسلام اور خلاف قانون اخراجات کے خلاف انگلی تک نہیں اٹھائی۔

ہمارے معاشرے میں سرمایہ دارانہ ذہنیت دن بدن فروغ پاتی جا رہی ہے اور اسی رفتار سے لالچ اور طمع میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ہمارے نوجوان، محنت کی بجائے مفت کی کمائی کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ ان نوجوانوں کی نگاہیں، بیویوں کے جہیزوں پر لگی ہوئی ہیں، جیسا کہ اس کی بدترین مثال کا مضمون کے شروع میں حوالہ دیا جا چکا ہے۔

تاہم یہ ایک ایسی خرابی ہے کہ جس کا علاج ممکن ہے۔ اگر ہمارے علماء شادی کو واقعی سنتِ رسول سمجھتے ہیں تو انہیں اس سنت کو، بے حرمت ہونے سے بچانا چاہیئے۔ نکاح کی رجسٹریشن یہی حضرات کرتے ہیں۔ اول تو انہیں ایسے نکاح رجسٹر کرنے سے انکار کر دینا چاہیئے اور اگر وہ کسی مجبوری سے ایسا کرنے پر مجبور ہیں، تو اس کی تفصیلات وہ حکومت کے نوٹس میں لائیں۔ خیال رہے کہ جہیز کی مالیت ان حضرات کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہوتی۔ اس طرح نکاح نامے میں فریقین کے حلفیہ بیان درج ہوں کہ شادی پر مقررہ حد سے زیادہ رقم خرچ نہیں ہوئی اور نکاح رجسٹرار اس کی تصدیق کرے۔ اس طریقے سے اس سنتِ رسول کو بے حرمتی سے بچایا جا سکتا ہے۔

لاہور کے سامعینِ درس متوجہ ہوں

درسِ قرآن بذریعہ وی سی آر (V-C-R) ہر جمعہ کی صبح ۹ بجے ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور میں ہوتا ہے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

ادارۂ طلوعِ اسلام کی

مطبوعات کی قیمتیں

(اکتوبر ۱۹۸۶ء)

نوٹ :- ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں ۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ کھلے پارے)	روپے ۱۵۰/-
پارہ نمبر ۱، ۳۰ (فی پارہ)	۶/- پیسے
پارہ نمبر ۲ تا ۲۹ (〃)	۵/- 〃
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ - مجلد)	۱۸۰/-
(تین جلدوں میں) فی جلد	۶۰/- 〃
لغات القرآن (مکمل سیٹ - مجلد)	۲۲۵/- 〃
جلد اوّل تازہ ایڈیشن فی جلد	۷۵/- 〃
بقیہ تین جلدیں - فی جلد	۵۰/- 〃
تبویب القرآن تازہ ایڈیشن	۲۵/- 〃
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	۷۵/- 〃
مطالب الفرقان (جلد دوم) (تازہ ایڈیشن	۷۵/- 〃
مطالب الفرقان (جلد سوم)	۷۵/- 〃
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	۹۰/- 〃
مطالب الفرقان (جلد پنجم)	۷۵/- 〃
مطالب الفرقان (جلد ششم)	۷۵/- 〃
نظامِ ربوبیّت (جدید ایڈیشن)	۷۵/- 〃

نام کتاب	قیمت
قرآنی قوانین (جدید ایڈیشن)	۲۵/- پیسے
اسلام کیا ہے (تازہ ایڈیشن)	۵۰/- 〃
من و یزداں (تازہ ایڈیشن)	۷۵/- 〃
برق طور (تازہ ایڈیشن)	۶۰/- 〃
جہانِ فردا	۴۰/- 〃
معراجِ انسانیت (تازہ ایڈیشن)	۹۰/- 〃
شاہکارِ رسالت (تازہ ایڈیشن)	۷۵/- 〃
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	۱۵/- 〃
ابلیس و آدم (تازہ ایڈیشن)	۷۵/- 〃
ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION	-
مجلّد (H.B)	۷۵/- 〃
کتاب التقدیر (تازہ ایڈیشن)	۱۰۰/- 〃
سلیم کے نام خطوط مکمل سیٹ	
جلد اوّل دوم (فی جلد)	۳۰/- روپے
جلد سوم (فی جلد)	۴۰/- 〃
تصوف کی حقیقت	۷۵/- 〃

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
طاہرہ کے نام خطوط	-/۱۰ روپے	فردوس گم گشتہ۔ عربی خود سیکھئے، پاکستان کا معمار اول	
اسلامی معاشرت	-/۶ "	اقبال اور قرآن۔ انسان نے کیا سوچا۔	
قرآنی فیصلے			
(چوتھی جلد -/۲۰ روپے) جلد پنجم۔ -/۲۰ روپے	-/۴۰ "	مقام حدیث۔ حسن کردار کا نقش تابندہ	
فجر الاسلام (مکمل دو جلدیں۔ فی جلد -/۸ روپے	-/۱۶ "	اسباب زوال امت۔ قرآنی فیصلے اول، دوم، سوم	
منزل بہ منزل	-/۱۵ "	**تصنیفات:** (انگریزی) ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب	
پرنسپل آف لا میکنگ اِن اسلام (انگریزی)	-/۶ "	PHENOMENA OF NATURE & QURAN (H-B)	-/۷۵ روپے
تاریخ الامت (۶ جلدیں)	-/۳۰ "	CONSPIRACIES AGAINST QURAN (H-B)	-/۶۰ "
حسب ذیل کتب کے سابقہ ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں		FOOD AND HYGIENE IN ISLAM (P-B)	-/۸ "
تازہ ایڈیشن چھپنے پر اعلان کیا جائے گا۔		THE HEAVENS THE EARTH AND THE QURAN	-/۷۵ "
جوئے نور۔ شعلہ مستور۔ جہاد سلسبیل۔ ختم نبوت اور تحریک احمدیت۔ بہار نو۔ الفتنۃ الکبریٰ		THE GATE WAY TO THE QURAN	-/۴۸ "

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ

۱۔ اندرونِ ملک پاکستان ...... -/۴۸ روپے
غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک .... -/۱۱۰ "

۲۔ غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک:

(i) ایران، عراق، مصر اور بنگلہ دیش -/۱۴۰ روپے
(ii) عرب امارات۔ لبنان۔ یمن۔ کویت۔ سعودی عرب۔ سری لنکا جزائر مالدیپ وغیرہ -/۱۵۰ روپے
(iii) انڈیا۔ برما۔ لیبیا۔ کینیا۔ یوگنڈا۔ جنوبی افریقہ وغیرہ۔ -/۱۶۰ روپے
(iv) یورپ کے ممالک (برطانیہ۔ فرانس۔ ناروے وغیرہ) -/۱۶۰ "
(v) جنوب مشرقی ایشیائی ممالک (فلپائن۔ سنگاپور۔ ملائیشیا۔ جاپان وغیرہ) -/۱۶۰ "
(Vi) امریکہ۔ کینیڈا، نیوزی لینڈ۔ آسٹریلیا۔ جزائر فجی وغیرہ -/۲۰۸ روپے

۳۔ مذکورہ بالا چندہ میں خرچ ڈاک شامل ہے۔ البتہ جو خریدار پرچہ بذریعہ رجسٹری منگوانا چاہیں ان کی طرف سے فیس رجسٹری (-/۳ روپے فی پرچہ) علیحدہ ادا کرنا ہوگا۔ والسلام

نوٹ: ماہنامہ طلوعِ اسلام کے لئے صرف، ادارہ طلوعِ اسلام کو لکھئے۔

کتابیں ملنے کے پتے: (۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

اِیمان بلا عمل

(جولائی ۱۹۴۱ء)

قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں بھی اپنے اندر عجیب سامانِ موعظت رکھتی ہیں۔ ان کے بڑھنے اور اُبھرنے کے زمانہ کو دیکھیئے۔ نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم (ایمان) اور اس کے حصول کی خاطر تگ و تازِ مسلسل (عمل) زندگی کی ساری کہانی دو لفظوں میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ دلوں میں ولولے، خون میں حرارت، آنکھوں میں چمک، سارا ماحول زندگی سے بھرپور، خاک کے ایک ایک ذرّے میں نوید حیات و رخشندہ، مصائب میں مسرت، مشکلات میں راحت، موت میں حیات کے سامان خوابیدہ! فتح و ظفر مندی پاؤں چومتی، سعادت و کامرانی رکاب تھامتی۔ اللہ کی نصرت کے فرشتے جلو میں، منزل کی تابناکی شمع راہ، دل، یقین کی دولت سے معمور، قدم، لذتِ جادہ پیمائی سے محوِ خرام۔ غرضیکہ تمام عمر دریا کی طرح ایک مسلسل روانی، غیر منقطع جدوجہد، یعنی ایمان و عمل کی زندہ تفسیر یہ تھی مسلمانوں کے دورِ عروج کی ابتداء۔ نبی اکرمؐ سے دریافت کیا گیا کہ مسلمان کی زندگی کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ سارا فلسفۂ حیات ایک جملہ میں مرکوز۔ یہ سپاہیانہ دور سَابِقُوْنَ بِالْخَیْرَاتِ (۳۵/۳۲) کا تھا۔ یعنی حسنِ عمل میں آگے بڑھنے کا دور۔ اس کے بعد ایک درمیانی دور (مقتصدین کا) آیا۔

مسلمانوں کی تاریخ

جو کچھ بزرگوں سے ترکہ میں ملا، اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ مجاہدانہ اعمالِ حیات کی طوفان انگیزیاں، درباری تکلفات کی بزم خیزیوں میں بدل گئیں۔ دینِ خداوندی کو تمام انسانی ضوابطِ زندگی (ادیانِ عالم) پر عملاً غالب دیکھنے کی بجائے، نظری مباحث اور منطقیانہ دلائل سے اس کی فوقیت و برتری ثابت کرنے ہی کو مقصدِ حیات سمجھ لیا۔ قوانینِ خداوندی، جن کی تفسیر اعمالِ زندگی سے ہونی تھی، حروف و نقوش کے پیکروں میں سجا کر رکھ دیئے گئے۔ رفتہ رفتہ قوائے عملیہ مفلوج ہو گئے۔ ہمتیں پست ہو گئیں ولولے سرد پڑ گئے۔ بایں ہمہ، اس دور میں بھی کہیں کہیں برسے ہوئے بادلوں میں بجلی کی چمک، اور جلے ہوئے نیستاں میں تبسمِ شرار نظر آتا رہا۔ اس کے بعد تیسرا دور (ظالمین کا) آیا۔ دورِ عمل پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ باقی رہا **ایمان**، سو اس کے متعلق انہیں اسلاف سے کتابوں کے ذخائر ملے، جو نظری مسائل کے پیچ در پیچ مباحث سے بھری ہوئی تھیں، اور یہ مسائل بھی یونان کے فلسفے اور عجم کے تصوّرات سے مستعار لیئے گئے تھے۔ اب ان کے نزدیک ایمان، چند الفاظ کو ایک خاص طریق سے دہرا لینے کا نام رہ گیا۔ اور اعمال چند رسوم کی میکانیکی انداز سے ادائیگی! حالانکہ ایمان سے مفہوم تھا۔ اللہ تعالیٰ کے متعین فرمودہ نصب العین کی صداقت پر غیر متزلزل یقین اور اعمال سے مقصد، اس نصب العین کے حصول کے لئے جدوجہد۔

لیکن اس آخری دور میں سارا دین سمٹ سمٹا کر چند الفاظ کی ادائیگی کا نام رہ گیا اور چونکہ ضابطۂ خداوندی میں نجات وسعادت ایمان سے مشروط تھی، اس لئے سمجھ لیا گیا کہ جو شخص ایک خاص انداز سے چند خاص الفاظ کو دہرا دے گا۔ اس کی کامرانیوں اور شادمانیوں کا اللہ ذمہ دار ہو جائے گا، کیونکہ ایمان کے صدقہ میں سعادت ونصرت کا عطا ہونا فرمودۂ خداوندی ہے۔ اس کے بعد یہ بحثیں چھڑیں کہ کیا اعمال کے بغیر خالی ایمان سے بھی نجات ہو سکتی ہے یا نہیں؟ حالانکہ اگر ایمان اور اعمال کا قرآنی مفہوم سامنے ہو تو اس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ایمان، وہ جذبۂ صادق ہے جو اعمال کا محرک ہوتا ہے۔ یہ وہ بیج ہے، جس سے شجرِ حیات، شاخِ طوبیٰ کی طرح بڑھتا، پھولتا اور پھلتا ہے۔ اس لئے جس بیج سے درخت پیدا نہیں ہوتا وہ بیج ناقص ہے۔

سردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

ایمان وعمل

قرآن کی رُو سے جس طرح وہ اعمالِ زندگی، جن کی بنیادیں ایمان پر نہیں ہوتیں، ایسی بجلیاں بن جاتے ہیں جو انسانیت کے امن وسلامتی کے خرمنوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیتی ہیں، اس طرح وہ ایمان جو خالی الفاظ کا مجموعہ سمجھ لیا جائے اور جس کی تصدیق اعمالِ حیات نہ کریں، برف کا ایسا تودہ بن جاتا ہے جو رگوں میں دوڑنے والے خونِ گرم کے ہر قطرہ کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس لئے فلاح وسعادت اس قسم کے ایمان سے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ آج بدبختی سے مسلمانوں میں ایک طرف ایسا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اصل مقصد "عمل" ہے ایمان کا اس سے کوئی تعلق نہیں یہ خیال ایسی کھلی ہوئی گمراہی پہ مبنی ہے کہ اس کی تغلیط اور تکذیب کے لئے کسی زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ لیکن دوسری طرف صدیوں سے یہ عقیدہ عام مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے کہ تنہا ایمان (یعنی چند الفاظ کا دہرا دینا) نجات کے لئے کافی ہے۔ ان کے نزدیک مَن قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّة کا مفہوم ہی یہ ہے کہ جس نے ان الفاظ کو زبان سے دہرا دیا۔ جنت کا وارث بن گیا قریب قریب تمام مسلمان کچھ اسی قسم کی خوش فہمی میں مگن ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس غلط عقیدہ نے انہیں کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ آج مسلمانوں پر جس قدر غربت وافلاس طاری ہے، یہ قوم محتاجی وبے کسی، ذلت اور رسوائیوں کے جن عمیق گڑھوں میں گر چکی ہے نکبت وافلاس کی جو ہولناک گھٹائیں ان پر چھائی جا رہی ہیں، ہلاکت وبربادی کے جو بے پناہ سیلاب ان کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ ذلت ومسکنت کی جو شرربار بجلیاں ان کے خرمنِ حمیت وغیرت اور عزت وناموس کو جلائے جا رہی ہیں، اگر بہ نگاہ تعمق دیکھا جائے تو ان کا ذمہ دار یہی غلط عقیدہ ہے جو ان کی جڑوں کو گھن کی طرح کھوکھلا کر گیا ہے اور جس نے انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ بنی اسرائیل کی طرح ان کا بھی ایمان ہے کہ ہم خدا کے چہیتے بیٹے ہیں۔ یہ بھی ان کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہرحال جنت میں جائیں گے خواہ ہم کچھ ہی کیوں نہ کریں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ قوم بھی خدا کی اس مغضوب ومعتوب قوم کی طرح ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کے عذاب الیم میں گرفتار ہے۔ لیکن نہیں سمجھتی۔ عاد وثمود کی طرح بتدریج تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے، لیکن نہیں محسوس کرتی۔ قوم لوط اور اصحاب ایکہ کی طرح ان کی شوکت و

مسلمانوں کی حالت

عظمت کے تختے الٹ چکے ہیں۔ ان کی تہذیب و تمدن کی فلک بوس عمارتیں کھنڈرات بن چکی ہیں، جو ہر صاحب بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ فریب خوردہ قوم دل رکھتی ہے اور اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتی۔ آنکھیں رکھتی ہے اور دیکھتی نہیں۔ کان رکھتی ہے مگر سنتی نہیں۔ اسے زمانہ کے تھپیڑے جھنجھوڑتے ہیں لیکن یہ انہیں خواب آور لوریاں سمجھ کر اور گہری نیند میں چلی جا رہی ہے۔ دنیا علم و عمل میں ترقی کرتے کرتے آسمانوں کو چھو آنے کی ٹھانے بیٹھی ہے[1]۔ لیکن یہ اوّل تو ان کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔ اور اگر کبھی کبھار چشم نیم باز سے دیکھتے ہیں تو ایک حقارت آمیز تبسم سے اتنا کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہاں! اس چند روزہ متاعِ حیات سے فائدہ اٹھا لو، اس کے بعد دنیا میں بھی ہمیں غالب رہنے والے ہیں۔ اور آخرت تو بالکل ہے ہی ہماری۔ پھر قیامت یہ ہے کہ یہ عقیدہ جہلا تک ہی محدود نہیں، بلکہ ان کے واعظ اور عالم، روز بروز اس عقیدہ کو پختہ تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک جیّد "مولوی" صاحب اکثر واعظ میں فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانو! کون کہتا ہے کہ گناہ نہ کرو۔ خوب کرو۔ جی بھر کر کرو لیکن ایک درود شریف اوّل اور ایک درود شریف آخر پڑھ لو مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ۔ اللہ کی رحمت کے یہ دو سمندر موجیں مارتے ہوئے ان کو بہا کر لے جائیں گے۔ حتیٰ کہ ابوالکلام آزاد جیسا شخص، اپنی تفسیر میں یہ وضعی حدیث نقل کرتا ہے کہ

والذی نفسی بیدہٖ لو لم تذنبوا لذھب اللہ بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون　　(مسلم عن ابی ھریرہ)

(رسول اللہ نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو، تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے، جس کا شیوہ، یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلبگاری کرے (ترجمان القرآن جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۵۹ مطبوعہ زمزم کمپنی)

یہ اس قوم کے احبار و رہبان کے مواعظِ حسنہ ہیں جن کے خدا کا فیصلہ ہے کہ

مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ع (۹۹/۷-۸)

جو شخص رائی کے ذرے کے برابر نیکی کرے گا وہ بھی اس کے سامنے آجائے گی اور جو برائی کے ذرے کے برابر برائی کرے گا وہ بھی اس کے سامنے آجائے گی۔

ایمان بلا عمل

قرآن کریم کے کسی صفحہ پر نگاہ ڈالیے، نجات و سعادت اور فلاح و بہبود کے لئے جہاں اٰمنوا آیا ہے اس کے ساتھ ہی عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بھی موجود ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر صرف دوسرے ٹکڑے کو ماننے والے يُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ يَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ط قرآن کریم کے ایک حصہ پر ایمان لانے اور دوسرے پر ایمان نہ لانے) کے جرم کے مرتکب قرار دیئے جاتے ہیں۔ تو دوسرے ٹکڑے کو چھوڑ کر صرف پہلے ٹکڑے پر ایمان لانے والے اس جرم سے کس طرح بچ سکتے ہیں حالانکہ قرآن کریم کا صاف صاف فیصلہ موجود ہے۔

[1] اب تو وہ سچ مچ آسمانوں کو چھو آئے ہیں۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ (۲۹/۲)

کیا لوگ یہ گمان کیئے بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان پر کوئی آزمائش نہیں ڈالی جائے گی۔

دوسری جگہ ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۱)

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ اللہ ابھی تک اس بات کو ابھار کر سامنے نہیں لایا کہ تم میں سے کون جہاد کرتا ہے اور ثابت قدم ہے۔

کیا آپ نے سورۂ توبہ میں نہیں دیکھا کہ جب منافق اپنے آپ کو مؤمن ظاہر کرتے ہیں تو ان کے ایمان کی شناخت کے لئے کون سا معیار مقرر کیا گیا تھا۔ یہ کہ

قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط (۹/۱۰۵)

اُن سے کہہ دو کہ ہاں! کچھ کر کے دکھاؤ تاکہ تمہارے اعمال کو خدا، اس کا رسول اور مومنین دیکھ لیں۔

اس سے بھی آگے بڑھیئے سورۃ انعام میں ہے کہ جب خدا کا عذاب سامنے آجائے گا تو اس وقت نہ تو اس شخص کو نفع پہنچے گا جو عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے گا اور نہ ہی اس شخص کو کہ جس نے ایمان کے ساتھ نیک عمل نہ کیا ہو گا۔ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (۶/۱۵۹) سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے زیادہ اور کون سے واضح الفاظ ہو سکتے ہیں جن میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا جاتا؟ یاد رکھیئے، جس ایمان کے ساتھ اعمال شامل نہ ہوں گے وہ ایمان کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے محبوب ہیں، اس واسطے کہ ہم ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن جس کے تم محبوب بنتے ہو، وہ تو اعلانیہ کہہ رہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وہ ایک مسلم کا اس کے اعمال کی وجہ سے "دوست" ہے نہ کہ اس کے زبانی دعووں کی بناء پر۔

وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (۶/۱۲۸)

اللہ کا دوست ہے بوجہ ان کے اعمال کے۔

کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بُرے اعمال کی سزائیں تجویز کی ہیں وہاں مسلم اور غیر مسلم، مؤمن و کافر میں کوئی تمیز، کوئی تفریق نہیں کی اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ط مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ لا (۴/۱۲۳)

نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہو گا نہ اہل کتاب کی جو بھی بُرا کام کرے گا اس کی سزا پائے گا۔

کسے باشد، جو بھی بُرائی کرے گا اس کے جُرم اُسے گھیر لیں گے وہ جہنم میں جائے گا اور وہیں رہے گا۔ (۲/۸۱) مثلاً حکم دیا جاتا ہے کہ ایمان والو سود نہ کھانا۔ اللہ سے ڈرتے رہنا تاکہ تم تقویٰ شعار بن سکو۔ لیکن اگر تم اس حکم کی خلاف ورزی کرو گے تو اس آگ سے ڈرو جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ کے ٹکڑے پر نگاہ ڈالیئے۔ خطاب یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا سے تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان سود خوار، ایمان کا مدعی ہے، لیکن جب اسے اس کے جرم کی سزا میں جہنم میں رسید کیا جاتا ہے تو وہ جہنم کوئی الگ نہیں، وہی ہے جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ فرمایئے اس شخص کے دعویٔ ایمان نے اس میں کیا امتیاز پیدا کر دیا؟ اس سے بھی آگے بڑھیئے! بدر کا میدان ہے۔ مسلمانوں کی کل کائنات تین سو تیرہ نفوس، کچھ مہاجرین، کچھ انصار۔ گھر بار، بیوی بچے، عزیز و اقارب، مال و دولت، سب کچھ چھوڑ کر ہتھیلیوں پر سر لئے خدا کے راستے میں جان جیسی گراں بہا چیز قربان کر دینے کے لئے تیار ہیں۔ یہ وہ ایمان والے ہیں جنہیں اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کہا گیا ہے۔ وہ ہیں جنہیں کے متعلق رسولِ خدا نے ابھی ابھی دعا میں فرمایا ہے کہ اے اللہ یہ مٹھی بھر جماعت، تیری نام لیوا، تیرے نام کی حفاظت کے لئے، جانیں قربان کرنے کے لئے، میدان میں آئی ہے۔ اگر یہ مٹ گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔ فرمایئے! ان کے ایمان میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ لیکن اسی مقام پر ان کا خدا ان سے کہتا ہے کہ یاد رکھو جو آج کے دن میدان جنگ سے منہ موڑے گا، سوائے اس کے کہ وہ لڑائی کے لئے پینترا بدلے یا اپنی جماعت سے ملنے کی خاطر پہلو بدلے، تو وہ خدا کے غضب کا مستوجب ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور یہ بُری جگہ ہے رہنے کی۔ (۸/۱۶)

بدر کا ایمان

زبانی اقرار پر جنت میں جانے کے متمنی ذرا آنکھیں کھول کر اس ارشادِ مقدسہ کو دیکھیں! جہاد تو عمل کی آخری منزل ہے۔ جو لوگ ایمان لائے تھے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی، ان کے متعلق سنیئے کہ کیا فیصلہ ہے۔

اور جو لوگ ایمان لائے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی، تو جب تک یہ لوگ ہجرت نہ کر آئیں، ان کے ساتھ (مسلمانوں کا) دوستانہ تعلق نہیں ہوگا۔ (۸/۷۲)

دیکھیئے ان لوگوں کے ایمان کی شہادت تو خدا خود دے رہا ہے کیونکہ انہیں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر پکار رہا ہے۔ لیکن یہ صرف ایمان کے دعوے دار ہیں۔ اصلی مومن، سچے ایماندار صرف وہ ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ ۝ (۸/۷۴)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہ لوگ اصلی مؤمن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور ان ہی کے لئے عزت کا رزق ہے۔

جو لوگ میدان میں آنے سے ہچکچاتے تھے۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی (۹/۹۳) ان کے برعکس۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَیْرٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ (۹/۸۸-۸۹)

لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے اور جہاد کیا اپنے اموال اور جانوں سے، یہی لوگ ہیں، جن کے لئے (سب) خوبیاں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔ ان کے لئے اللہ

نے ایسی جنّات تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے دیکھئے! سب خوبیاں، کامیابی و کامرانی کی تمام نعمتیں، دنیا کی سرخروئی اور عاقبت کے انعام سب انہی کے لئے ہیں جو ایمان کے ساتھ عمل میں پورے اترتے ہیں۔

یہی نہیں کہ آخرت ہی فلاح و بہبود ہی عمل کے ساتھ متعلق ہوں، اس دنیا کی عزت و وقار کی زندگی، خوشحالی و خوش بختی کی زندگی، سرفرازی و سربلندی کی زندگی، یعنی وہ زندگی جو فی الحقیقت ایک مومن کی زندگی ہونی چاہیئے وہ بھی عمل ہی کے ساتھ مشروط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکومت اس لئے دی تھی کہ ان کے کام دیکھے نہ زبانی دعویٰ

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۴)

پھر ہم نے تمہیں دنیا میں حکومت دی، پہلی قوموں کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو

اگر تم عمل کی دنیا میں پورے نہیں اترو گے تو تمہارے ایمان کے الفاظ کوئی قیمت نہیں رکھیں گے وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ط (۹/۳۹)

اس لئے کہ جہاں اس کا ارشاد ہے کہ:۔

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۷/۴۳)

ان سے پکار کر کہہ دیا جائے گا کہ یہ جنت ہے جس کے تم اعمال کے باعث وارث قرار دیئے جاتے ہو۔

وہیں اس دنیا کی جنت کے متعلق بھی اس کا فیصلہ ہے کہ:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا کہ جو تم میں سے ایمان لائیں اور عملِ صالح کریں تو اللہ ان کو زمین کی بادشاہت عطا فرمائے گا۔

پس اگر تم چاہتے ہو کہ اس دنیا میں تمہاری ہستی قائم رہے تو ایمانِ محکم کے ساتھ عملِ پیہم بھی پیدا کرو کہ یہی سچے مومنوں کی نشانی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

یقیناً مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر ان کے ایمان میں ذرا جنبش نہ ہوئی اور انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے اموال و نفوس سے جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

ورنہ یاد رکھو کہ خدا کے فیصلے، فطرت کی تعزیریں، اٹل ہیں، غیر جانبدار ہیں۔ ہر چیز کی بقا عمل سے ہے۔ انسان کا تمام تر سرمایہ عمل سے ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے۔ نتائج عمل سے پیدا ہوتے ہیں اور سے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں نوری ہے نہ ناری ہے۔

وہ قول، وہ زبانی دعویٰ، وہ اقرار، وہ اصطلاحی ایمان، جس کی تائید اعمال سے نہیں ہوتی۔ جس کی تصدیق آپ کے قلوب اور جوارح نہیں کرتے، قرآن کی میزان میں ایک پرِ کاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ نہیں بلکہ

بلکہ ایسا زبانی دعویٰ ایک جرم عظیم ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

اللہ کے نزدیک یہ بہت بُری بات ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جو کر کے نہ دکھاؤ

اور اگر خدا کے ان کھلے کھلے فیصلوں کے بعد بھی آپ اس زعم باطل میں رہیں کہ چونکہ آپ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں، صبح سویرے منہ پر ہاتھ پھیرتے وقت زبان سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بھی نکل جاتا ہے، اس لئے ضرور آپ جنت کے وارث بن جائیں گے اور ساری دنیا پر غلبہ آپ ہی کا ہو جائے گا اور محض اس لئے ہو جائے گا کہ آپ مسلمان کہلاتے ہیں۔ تو یاد رکھئے، یہ سراسر دھوکا ہے، فریب ہے۔ اور فریب خدا کے ساتھ نہیں، دوسروں کے ساتھ نہیں، بلکہ خود اپنے ساتھ ہے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ۔ یاد رکھئے! آج دنیا میں جہد للبقاء (زندہ رہنے کی کشمکش) بڑی سخت ہو گئی ہے۔ قوموں میں باہمی منافست ہے، مقابلہ کی دوڑ ہے جو قوم، جو ملک، جو شخص اس دوڑ میں، پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے ٹھہر گیا۔ ہلاک ہو گیا۔ پیچھے سے آنے والی قومیں اسے بے رحمی سے کچلتی ہوئی آگے نکل جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ قَاعِدِيْنَ (بیٹھنے والے) اور مجاهدين (دوڑنے والے) کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ کیا یہ قانون آپ پر نافذ نہیں ہو گا۔ کیا ارباب اقتدار آپ کو اس لئے چھوڑ دیں گے کہ آپ خاص قسم کے نام رکھتے ہیں، یا یہ عقیدہ دل میں جمائے بیٹھے ہیں کہ ہمارا زبانی اقرار ہماری کامیابیوں کے لئے کافی ہے! یاد رکھئے! فطرت کسی کی سوتیلی ماں نہیں۔ اگر اس نے پہلی قوموں کو تباہ کر دیا تو اس لئے کہ ان میں قوت عمل مفقود ہو چکی تھی، نہ اس لئے کہ ان سے کوئی ضد تھی۔ اور اب اگر آپ بھی وہی کچھ کریں گے جو ان قوموں نے کیا تھا تو وہ آپ کو اس لئے نہیں بخش دے گی کہ آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ ایسا سمجھنا خدا کے قانون کے متعلق بڑا غلط اندازہ لگانا ہے۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

۱۔ بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو۔

۲۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔

۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

حقائق و عبر

۱۔ شریعت بل اور جماعتِ اہلسنّت

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے اپنی تین ستمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں پہلے صفحہ پر جماعت اہلسنّت کا یہ موقف جلی سرخی سے شائع کیا ہے کہ اس نے سینٹ میں پیش ہونے والے شریعت بل کو مسترد کر دیا ہے۔ اس کی تفصیلات ان الفاظ میں دی گئی ہیں :۔

جماعتِ اہلسنّت کے رہنماؤں نے شریعت بل کو یکسر مسترد کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ملک میں نظامِ مصطفیٰؐ کو فی الفور نافذ اور اس سلسلہ میں فقہ حنفی کو پبلک لاء کے طور پر رائج کیا جائے۔ جماعتِ اہلسنّت کے ایک وفد نے آج وفاقی وزیر عدل و پارلیمانی امور اقبال احمد خاں سے تین گھنٹے کی تفصیلی ملاقات کے دوران نویں آئینی ترمیمی بل اور اسلامائزیشن کے بارے میں مذاکرات کئے اور نظام مصطفیٰ کے عملی نفاذ کے بارے میں ۱۷ نکات پر مشتمل سفارشات پیش کی ہیں جس کے بارے میں جماعتِ اہلسنّت کے ترجمان نے بتایا کہ وزیر عدل نے وزیر اعظم اور قانونی ماہرین کے ساتھ مشورہ کر کے بیس روز کے بعد ان سے دوبارہ مذاکرات کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ جماعتِ اہلسنّت کے مرکزی ناظمِ اعلیٰ صاحب زادہ حاجی محمد فضل کریم کی قیادت میں اس وفد میں شیخ الحدیث مولانا محمد شریف رضوی، مولانا محمد اشرف مولانا فضل قادری (اردن) چوہدری محمد صدیق رندھاوا، سید ضیاالحق شاہ سلطان پوری اور صاحب زادہ جلال الدین کاظمی شامل تھے۔ صاحب زادہ فضل کریم نے بتایا کہ ہم نے حکومت پر اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں فقہ حنفی کے پیروکاروں کی غالب اکثریت کے پیشِ نظر قرآن و سنّت کی تشریح کے سلسلے میں حنفی فقہ رائج کیا جائے ہر سطح پر قانون سازی اور سرکاری پالیسیاں اسی فقہ کے مطابق وضع کی جائیں جب کہ دوسری فقہ کے پیروکاروں کے معاملات اپنی اپنی فقہ کے مطابق بنائے جائیں۔

۲۔ شریعت بل سے فرقہ واریت پھیلے گی:

جمعیت اہلحدیث پاکستان کی مجلس عاملہ نے ابھی حال ہی میں سینٹ میں پیش کردہ شریعت بل کے بارے میں یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اس سے ملک میں فرقہ واریت پھیلے گی۔ اس سرخی کے تحت روزنامہ امروز لاہور اپنی ۳ ستمبر کی اشاعت میں جمعیت کا فیصلہ ان الفاظ میں نقل کرتا ہے۔

جمعیت اہلحدیث پاکستان کی مجلس عاملہ نے شریعت بل کو ملک میں فرقہ واریت کی کوشش قرار دیا ہے اور شرط عائد کی ہے کہ بل کی دفعہ ج اور د کو خذف کیا جائے تو اس کی حمایت کی جا سکتی ہے۔ اس فیصلے کا اعلان آج ایک پریس کانفرنس میں جمعیت کے سیکرٹری جنرل علامہ احسان الٰہی ظہیر نے کیا۔

انہوں نے کہا کہ ملک کے مسلمہ فرقوں اور گروہوں کے علماء نے بھی اس کی مخالفت کی ہے اور اسے فریب قرار دیا ہے مثلاً مولانا فضل الرحمٰن اور جمعیت علمائے اسلام کے دوسرے علماء اور مولانا شاہ احمد نورانی اور جمعیت علمائے پاکستان کے دوسرے علماء اس تنبیہ کے بعد جمعیت اہلحدیث یہ ضروری خیال کرتی ہے کہ کوئی خود غرض اور مطلب پسند گروہ جمعیت کی اس واضح، ٹھوس اور حقیقت پسندانہ پالیسی کو اپنے ذاتی اغراض کا نشانہ نشانہ نہ بنا سکے اور اس سلسلہ میں شریعت کے نفاذ کے لئے جمعیت پر کوئی گریز کا الزام نہ رکھ سکے۔ ہم واضح طور پر اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا وجوہ کی بنیاد پر اس حکومت سے کسی قسم کی اسلام دوستی اور معقولیت کی توقع نہ رکھنے کے باوجود اور اس شریعت بل کو خالصتاً ایک سیاسی ہتھکنڈا سمجھنے کے باوصف ہم مجوزہ شریعت بل کی حمایت کے لئے صرف اس وقت آمادہ و تیار ہو سکتے ہیں کہ بل کی بعض شقوں میں تبدیلی کر دی جائے۔

انہوں نے کہا کہ شریعت بل کی دفعہ ۲ میں شریعت کی تعریف کے لئے شق ا اور ب ہی کافی ہے اور اس کی شق ج اور د نہ صرف یہ کہ ہمارے لئے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں بلکہ خود شق ا کے الفاظ کے منافی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں بسنے والے سارے مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ شریعت ان پر مکمل ہو گئی ہے اور آپ کے بعد کسی کی بات چاہے وہ کتنا ہی مقدس اور محترم کیوں نہ ہو شریعت نہیں ہو سکتی اور اگر کسی بڑے سے بڑے کی بات کو بھی شریعت تسلیم کر لیا جائے تو پھر صاحب شریعت کے منصب ختم رسالت و شریعت کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا۔ اس لحاظ سے مجوزہ شریعت بل کی شق 'ج' اور 'د' نبی علیہ السلام کی ختم نبوت اور منصب امامت و رسالت کے بھی منافی ہے۔

۳۔ پاکستان اور ملّا حضرات :

ہفت روزہ استقلال لاہور نے اپنی ۱۶ اگست ۸۶ء کی اشاعت میں پاکستان کے ایک سابق وزیر اطلاعات جناب نوابزادہ شیر علی خان صاحب کا انٹرویو شائع کیا ہے۔ جس میں انہوں نے پاکستان کی بنیاد کے مختلف عوامل پر گفتگو کی ہے۔ آپ نے فرمایا ہے :۔

میں اپنے پاکستانی بھائیوں پر یہ ضرور واضح کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی بنیاد مختلف عوامل پر پڑی تھی اور اسلام کوئی واحد عامل نہیں جس کی بنا پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہو۔ اسلام کا نام بالآخر تحریک میں جان ڈالنے کے لئے لیا گیا تھا۔ اسلام کا نام لئے جانے کے بعد بھی چند ملّا حضرات مطالبہ پاکستان سے اس لئے خوش نہیں تھے کہ ان کے گڑھ ہندوستان میں تھے اور انہیں یہ اندیشہ لاحق تھا کہ پاکستان قائم ہو جانے پر ان کا بیس BASE کمزور ہو جائے گا ان ملاؤں نے قائدِ اعظمؒ کی مخالفت کرتے ہوئے اس بات کو چنداں اہمیت نہ دی کہ قائدِ اعظمؒ کا تصور پاکستان آزادی اور انسانیت کا تصور تھا۔ قائدِ اعظمؒ قرآن کی اصل روح سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انہیں علم تھا کہ اسلام میں جبر کا کوئی تصور نہیں بلکہ اس میں وہ لچک موجود ہے جو دنیا کی ہر قوم اور ملک کو متاثر کرتی ہے۔ دوسری طرف مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے ملاؤں کا کاروبار تعصب اور نفرت پھیلا کر ہی چل سکتا تھا اور یہ طرزِ عمل قائدِ اعظمؒ کے اندازِ فکر سے مختلف تھا۔

(صفحات ۲۱۔ ۲۲)

انٹرویو کے شروع میں نوابزادہ صاحب کا تعارف جماعتِ اسلامی کے قریبی حلقہ کے لوگوں میں سے ایک کے طور پر کرایا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پاکستان کی مخالفت کرنے والے ان ملاؤں میں جماعتِ اسلامی کو شریک نہیں سمجھتے۔ حالانکہ قیامِ پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت اسی جماعت اسلامی نے کی تھی، جس کی تفصیلات متعدد بار طلوعِ اسلام کے صفحات پر پیش کی جا چکی ہیں۔

۴۔ مودودی بھی ملّا ہی نکلا :

محترم مم رشن ہمارے ملک کے مشہور صحافی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک کالم میں علامہ اقبالؒ کے حوالے سے یہ لکھا کہ علامہ صاحب مودودی صاحب کو ایک عام ملّا ہی سمجھتے تھے، اس پر جماعتِ اسلامی کی جانب سے انہیں ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے۔ اس تنقید کے سلسلے میں وہ وضاحت کرتے ہوئے روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ۴ ستمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں :۔

جماعتِ اسلامی کے ہیڈ کوارٹرز "منصورہ" کے ایک کارکن نے اپنے مکتوبِ گرامی میں میرے اس

بیان کو ہدف تنقید بنایا ہے کہ میں نے حضرت علامہ اقبالؒ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق یہ کہتے سنا تھا کہ "مودودی بھی ملا ہی نکلا"۔

جماعت اسلامی کے معزز ترجمان نے مجھ سے پوچھا ہے کہ کیا میں نے اقبال سے منسوب فقرہ کو کبھی پہلے بھی کہیں نقل کیا تھا۔ جواب یہ ہے کہ ہاں میں دو مرتبہ "پاکستان ٹائمز" میں اڈیٹر کے نام خطوط کالم میں لکھا کر چکا ہوں۔

دوسرا سوال انہوں نے یہ پوچھا کہ کیا میں علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری ایام میں چوبیس گھنٹے ان کے پاس رہتا تھا؟ اس سوال کا جواب بھی ہاں میں ہے۔ ویسے تو میں چند سال سے ان کے پاس عموماً روزانہ جایا کرتا تھا۔ لیکن ان کی خطرناک علالت کے آخری دنوں میں مجھے جاوید منزل میں قیام کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ ان ایام میں بھی دن رات میں ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔

میں اس شخص کو لعنتی سمجھتا ہوں جو حضرت علامہ اقبالؒ جیسے نادر روزگار انسان سے کوئی غلط بات منسوب کر کے تشہیر کرے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں بلا خوف تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اپنی پچاس سالہ صحافتی زندگی کے دوران میں نے کبھی ایک بار بھی سید مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو اپنی معاندانہ تنقید کا ہدف نہیں بنایا اس کے برعکس میں قیام پاکستان کے بعد ان سے عقیدت و احترام سے ملتا رہا ہوں کیونکہ میں ذاتی طور پر انہیں ایک عظیم محب الوطن پاکستانی سمجھتا ہوں۔

(م ر ش)

۵۔ اولیاء اللہ کی کرامات :

ہفت روزہ الاسلام نے اپنی ۵ ستمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں اولیاء اللہ کی ان کرامات کا ذکر کیا ہے۔ جو بریلوی حضرات عام طور پر بیان کرتے رہتے ہیں۔ ایک کرامت قارئین طلوع اسلام بھی ملاحظہ فرمادیں۔

یہ حضرات الا اِنَّ اولیاء اللہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

اے عاشقانِ رسولؐ ! اولیاء اللہ کے کیا کہنے ہیں۔

سنو ! ایک شہزادی ایک کامل ولی اللہ کی مرید تھی اس نے اپنے محل پر ایک بہت بلند مینار بنا رکھا تھا۔ وہ اس پر چڑھ کر مناظر قدرت دیکھا کرتی تھی ایک دن وہ اس مینارہ سے گر پڑی، اس کے پیر نے اس کو ہاتھوں پر اٹھا کر زمین پر رکھ دیا۔ وہ حیران ہو کر اپنے پیر سے پوچھتی ہے۔ پیر و مرشد۔ آپ کہاں سے آئے ہیں اور مجھے بچا لیا ہے؟ پیر صاحب نے فرمایا تو از مینارہ آمدی من از بخارا آمدم۔ تو مینارہ سے آئی ہے اور میں بخارا سے آیا ہوں۔ یعنی سینکڑوں کوس دور سے آیا ہوں تجھے بچانے کے لئے پس پھر کیا ہوا۔ نعرے مار مار کر سارا مجمع بے قابو ہو گیا۔

طلوعِ اسلام ۔ کیا ان حضرات کے لئے یہ جائز ہے کہ غیر محرم لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں پہ اٹھاتے رہیں۔

۶۔ برطانیہ میں پاکستانی پیروں کی گدیاں!

روزنامہ جنگ لاہور نے اپنی ۱۵ ستمبر ۱۹۸۶ء میں برطانیہ میں پاکستانی پیروں کے کاروبار کے بارے میں یہ خبر شائع کی ہے۔

"پیری مریدی کا رجحان اب برطانیہ میں بھی شروع ہوگیا ہے اور پاکستانی تارکین وطن کے علاوہ بڑی تعداد میں انگریز بھی برطانیہ کے مختلف علاقوں میں گذشتہ چند برسوں کے دوران قائم ہونے والے پاکستانی پیروں کے حجروں سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق برمنگھم اور گلاسگو میں بہت سے پاکستانی پیروں نے اپنی مستقل گدیاں بنا رکھی ہیں جہاں پہ مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے افراد صبح سے شام تک تعویز گنڈے حاصل کرتے ہیں۔ ان پیروں نے اپنے حجروں کو جدید انداز میں ڈھالا ہوا ہے اور بہت سے پیروں نے اپنے حجروں میں تعویز گنڈے دینے کے لئے جدید مشینیں لگا رکھی ہیں اور اس طرح تعویز گنڈوں میں بھی جدیدیت کا رجحان نمودار ہونے لگا ہے۔ پیروں کی سب سے زیادہ تعداد لندن کے علاقہ ولزڈن گرین میں ہے۔ ان پیروں میں سے بیشتر پیروں کا تعلق جہلم، فیصل آباد اور گوجرانوالہ سے ہے اور اکثر انگریز شام کو جوا خانے جانے سے پہلے ان پیروں سے خصوصی دعائیں کرواتے ہیں۔ ان پیروں کا کہنا ہے کہ وہ ریس کے گھوڑوں کے جیتنے کے لئے خصوصی تعویز رکھتے ہیں۔ اگر ان کا تعویز کسی گھوڑے کو پہنا دیا جائے تو اس گھوڑے کی جیت یقینی ہو جاتی ہے۔ ان پیروں کے پاس محبت میں ناکام ہونے والی اکثر انگریز لڑکیاں آتی ہیں یہ ان کو انگریزی میں لکھے ہوئے تعویز دیتے ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کا محبوب انکی گرفت میں آجائے گا۔"

۷۔ اہل حدیث کی کٹ حجتی اور غلط بیانی!

کچھ عرصہ پہلے طلوعِ اسلام میں فرقہ اہلحدیث کی توجہ دو امور کی طرف دلائی گئی تھی۔ ایک درود شریف کی غلط عبارت کے بارے میں اور دوسرے زمین کی بٹائی کو سود قرار دینے والی احادیثِ رسول کا ان کی جانب سے انکار۔ حالانکہ یہ احادیث نہ صرف یہ کہ قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق ہیں بلکہ جدید علمی تحقیق بھی انہیں سچا سمجھتی ہے، اسی بناء پر پرویز صاحبؒ ان احادیث کو سچا تسلیم کرکے بار بار ان کا ذکر کرتے تھے، کیونکہ ان پہ عمل کرنے سے پاکستان کے سات کروڑ غریب کسانوں کا بھلا ہوتا ہے۔ اہلحدیث علماء نے درود کی غلط عبارت کی طرف تو خوب توجہ دی ہے لیکن بٹائی کو حرام اور سود قرار دینے والی احادیث کے بارے میں ابھی تک ایک لفظ

بھی اپنے منہ سے نہیں نکالا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سچی احادیث کو تسلیم کرنے سے ان کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ اور انہیں ملک کے سات کروڑ غریب کسانوں کے مقابلے میں اپنا ذاتی مفاد زیادہ عزیز ہے!۔

درود کی صحیح عبارت کے بارے میں بھی ان لوگوں نے عجیب رویہ اختیار کیا ہے۔ ہم نے ان پر واضح کیا تھا کہ سلف صالحین سے اس درود کی جو صحیح عبارت منقول ہے وہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس میں آلہٖ کا اضافہ بعد میں شیعہ حضرات نے کیا۔ جو عربی قواعد کے مطابق غلط ہے۔ اسے عربی قواعد کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ آلہٖ سے پہلے حرفِ جر "علی" کا اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ ضمیر پر اسم ظاہر کا عطف نہیں ہو سکتا اور اس کے ثبوت میں ہم نے نحو کے امام سیبویہ کا یہ فیصلہ نقل کیا تھا کہ اگرچہ شعری ضروریات کے تحت تو ایسا کیا جا سکتا ہے لیکن نثر میں اس کا استعمال نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ ایک فعل قبیح ہے لیکن اس کے باوجود اہل حدیث حضرات نے درود کی غلط عبارت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے شعر نقل کرنے شروع کر دیئے۔ ہم نے انکی خدمت میں گزارش کی کہ عربی زبان کی مستند کتابیں قرآن مجید اور احادیث کے مجموعے ہیں، ان سے کوئی مثال پیش کریں۔

حدیث کی سینتالیس کتابوں میں سے تو انہیں کوئی ایک مثال بھی نہ ملی البتہ قرآن مجید کی سورۃ النساء کی ایک آیت وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهٖ وَالْأَرْحَامَ کو توڑ مروڑ کر انہوں نے درود کی غلط عبارت کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ آیت کو اس طرح توڑنے مروڑنے کو انہوں نے خود تسلیم بھی کیا۔ اور واضح فرمایا کہ قرآن مجید کا جو متن اس وقت امتِ مسلمہ کے نزدیک مسلّمہ ہے، اس کی رُو سے تو جائز نہیں لیکن قرآن مجید کی ایک غیر مروّجہ قرأت میں وَالْأَرْحَامَ کو الارحام پڑھا گیا ہے اور اس کی روشنی میں اسم ظاہر کا ضمیر پر عطف ہو سکتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اہلحدیث حضرات قرآن مجید کی آیت کے ہیر پھیر سے ایک غلط بات کو ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ تفسیر قرطبی جس صفحہ کا انہوں نے حوالہ دیا ہے۔ اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ عربی گرامر کے دونوں مکاتب کے ائمہ کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں۔ ائمہ بصرہ کے نزدیک یہ قرآن مجید میں تحریف ہے جب کہ کوفی ائمہ کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں اور یہ ایک فعلِ قبیح ہے۔ ان ائمہ کی تائید کرتے ہوئے کہ ایک صحیح حدیث میں الْأَرْحَامَ کا لفظ م کی زیر کے ساتھ منقول ہے اور قرآنِ مجید میں اس قسم کا ہیر پھیر کرنے والوں کے خلاف علامہ قرطبی نے یہ فتویٰ دیا ہے:

فَمَنْ رَدَّ ذٰلِكَ رَدَّ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم

(ترجمہ) یعنی جس نے الارحامَ کی صحیح قرأت کو رد کیا، اس نے گویا رسول اللہ صلعم کو رد کیا

(تفسیر قرطبی جلد پنجم ص۴)

مختصر یہ کہ ہمارے نیم تعلیمیافتہ اہل حدیث حضرات ائمہ حدیث کی تحقیق کے مطابق درود کی غلط عبارت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے نعوذ باللہ خود رسول اللہ صلعم کو رد کرنے لگے ہیں! یہ رسول اللہ صلعم کی توہین نہیں تو اور کیا ہے!

اہلحدیث حضرات نے بار بار یہ دعوے بھی کیا ہے کہ غلط عبارت والا درود ہی زیادہ مناسب ہے۔ (ملاحظہ ہو ہفت روزہ اہلحدیث بابت ۱۲ ستمبر ۱۹۸۶ء)

ہم نے عرض کیا تھا کہ حدیث کی ۴۷ معروف کتابوں کے جا معین نے اس زیادہ مناسب درود کو استعمال نہ کر کے اس بات کا ثبوت مہیا کیا ہے کہ انہیں عربی زبان کا صحیح ذوق نہ تھا۔ اور جب انہیں عربی زبان کا صحیح ذوق ہی نہ تھا تو پھر ان کے مجموعہ ہائے احادیث کو کیسے مستند سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

یہ حضرات بار بار علامہ شوکانی اور طبرانی کا حوالہ دے رہے ہیں۔ حالانکہ علامہ شوکانی شیعہ عالم تھے جس کی تصریح ان کی کتاب نیل الاوطار کے مقدمے میں کی گئی ہے اور یہی حالت طبرانی کی ہے۔ اس کی تائید میں اب انہوں نے امام ابن تیمیہ کی کتاب منتقی الاخبار کا حوالہ بھی دیا ہے حالانکہ یہ کتاب اسی شیعہ عالم یعنی علامہ شوکانی کی شرح کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ ویسے امام ابن تیمیہ کی سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، انہوں نے اپنی کسی کتاب میں درود کی اس غلط عبارت کو استعمال نہیں کیا۔ اس سلسلے میں اب علامہ ابن حجر عسقلانی کی دو کتابوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ یہ کتابیں تو ہماری نظر سے نہیں گزریں لیکن علامہ عسقلانی نے اپنی مشہور کتاب فتح الباری کی چودہ مبسوط جلدوں میں کہیں ایک دفعہ بھی یہ غلط عبارت استعمال نہیں کی۔ اپنی غلط بات کے ثبوت میں اہلحدیث حضرات نے تفسیر ابن کثیر کا نام لے کر تو غلط بیانی کی حد کر دی ہے۔ اس ساری تفسیر کا ہم نے غور سے مطالعہ کیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی درود کی غلط عبارت استعمال نہیں کی گئی۔ عام طور پر انہوں نے صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی استعمال کئے ہیں اور اگر کہیں انہوں نے اللھم کا اضافہ کیا ہے تو اس سے پہلے عربی قواعد کے مطابق حرف جر 'علی' ضرور لائے ہیں۔

یہ ہے حدیث کے علمبرداروں کا حدیث کے بارے میں طرز عمل۔ سچی احادیث جن سے کروڑوں انسانوں کا بھلا ہوتا ہے۔ اسے تسلیم نہیں کرتے کیونکہ اس سے ان کے مالی ذاتی مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ اور پھر اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے، قرآن مجید کی آیات میں ہیر پھیر، احادیث کی علمی حیثیت کم کرنے بلکہ بقول علامہ قرطبی خود رسول اللہ صلعم کو رد کرنے اور مفسرین کرام پر جھوٹ بولنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین اسلام صرف رفع یدین، امین بالجہر اور سینے پر ہاتھ باندھنے کا نام ہے۔ باقی اپنے جھوٹے مفاد کیلئے قرآن مجید اور احادیث سے، جو مرضی آئے سلوک کرو۔ جس کی تفصیلات سطور بالا میں پیش کی جا چکی ہیں۔

محترم پرویزؒ صاحب کا ہفتہ وار درس قرآن کریم

محترم پرویزؒ صاحب کے اس درس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ مرکزی درسگاہ تو ادارۂ طلوع اسلام (B/۲۵ گلبرگ ۲) ہے جہاں یہ درس (آج کل) ہر جمعہ کی صبح ۹ بجے بذریعہ وی سی آر (V.C.R) ہوتا ہے لیکن اندرون پاکستان اور بیرونی ممالک میں اسے ٹیپس (TAPES) کے ذریعے عام کیا جاتا ہے۔ حسب ذیل مقامات پر یہ (V-C-R) کے ذریعے نشر ہوتا ہے:۔

کراچی:۔ ہر جمعہ ۹½ بجے صبح
کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ
نیو چالی فون نمبر:۔ ۲۳۸۸۲۸

اوسلو:۔ (ناروے) ہر اتوار شام ۵ بجے بمقام:۔
JINNAH HALL, KEYSERS GATE-I
OSLO—I
زیر انتظام محترم امجد محمود صاحب نمائندہ بزم فون نمبر 02-615756

لندن:۔ (یوکے) ہر ماہ کے آخری اتوار دو بجے بعد دوپہر بمقام
47 HURLE ROAD
GREEN FORD MIDDLESEX
TEL: 01—578—5631

ٹورنٹو:۔ (کینیڈا) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح
335 DRIFTWOOD-AVE:#311,
DOWNS VIEW, TORONTO (ONT:)
M3N—2P3, TEL:(416) 661—2827

پشاور:۔ ہر جمعہ صبح ۱۰½ بذریعہ (VCR)
رہائش: سیٹھ افضل خان نمائندہ بزم
بالمقابل رحمان برادرز ٹمبر کارپوریشن یونیورسٹی روڈ
تہکاں پایاں پشاور

جہلم:۔ ہر ماہ کا آخری جمعہ بعد نماز جمعہ یوسف بٹ صاحب
بٹ آئرن سٹور چک جمال روڈ
کالا گوجراں جہلم

لاہور:۔ ہر جمعہ ۹ بجے صبح ۔ ۲۵-بی گلبرگ ۲
نزد پولیس اسٹیشن فون نمبر:۔ ۸۸۰۸۰۰
(بذریعہ وی سی آر (V-C-R)

گوجرانوالہ:۔ ہر جمعہ بعد نماز جمعہ درس قرآن کریم بذریعہ وی سی آر
دفتر بزم طلوع اسلام ملحق رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت نمائندہ بزم گل روڈ گوجرانوالہ

گجرات:۔ ہر جمعرات تین بجے سہ پہر رہائش گاہ:۔
ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب جناح کالونی (گجرات) ٹیلیفون نمبر:۔ ۳۶۳۰ + ۳۷۴۰

فریڈرکستاد:۔ (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا اتوار ۱۲ بجے بمقام
ARNE-SVENDSENS-GATE-1, 1600
FREDRIKSTAD, NORWAY
TEL:(032) 10287 / 21804

برمنگھم:۔ (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے بعد دوپہر
227/229 ALUM ROCK ROAD 38—
3 BH (BIRMING-HAM)

ملتان:۔ جمعہ ۹ بجے صبح
دفتر میسرز شاہ سنز
بیرون پاک گیٹ (فون نمبر:۔ ۳۱۰۷۱)

لندن یوکے:۔ ہر ماہ کے دوسرے اتوار 39 MANSELL
RD GREENFORD MIDDLESEX TEL 01-575-5862

اور ذیل کے مقامات پر، عام (TAPES) کے ذریعے

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام اور درس کے کوائف
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲½ بجے بعد دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, TELPHONE No, 553 — 1896
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے:۔ صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ باہتمام غلام صابر صاحب
فیصل آباد	جمعہ ۳½ بجے سہپہر	حیات سرجری کلینک، ۲۳/C پیپلز کالونی نمبر ۱ فون نمبر:۔ ۴۲۸۵۵
ہنگو	جمعہ ۵½ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ فون نمبر (۶۷)
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جے۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
پنجکسی تحصیل کبیر والہ (ملتان)	جمعہ ۳ بجے سہپہر	مطب حکیم احمد الدین مرحوم (نمائندہ بزم) چوہدری عبدالعزیز صاحب ایم اے
گجرات	جمعہ بعد نماز جمعہ اور اتوار ۴ بجے سہپہر	۱۲/۲۔ بی بھمبر روڈ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلال پور جٹاں	جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	۱۔ جمعہ ۴ بجے سہپہر ۲۔ اتوار ۴ بجے سہپہر	رہائش گاہ:۔ صلاح الدین صاحب واقع 234-K-L کہیال (ایبٹ آباد) رہائش گاہ:۔ غلام مصطفےٰ اعوان صاحب K-356 کچہ گراؤنڈ (ایبٹ آباد)
بوریوالہ	ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا جمعہ بعد نماز جمعہ	بر مکان محمد اسلم صابر مرضی پورہ گلی نمبر ۵ تیسرا چوک ملتان روڈ۔ بورے والہ
سرگودھا	ہر جمعہ صبح ۹ بجے	رہائش گاہ:۔ ارشد محمود ارشد ۶۰/A سول لائن ریلوے روڈ سرگودھا (جو ما بین خیام سینما اور شمع سینما مین ریلوے روڈ پر واقع ہے) (فون ۴۷۱۶)

جنگ اور انسان

(علامہ پرویز علیہ الرحمۃ ۱۹۶۳ء)

جیسا کہ میں نے ایک دفعہ اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔

انسان بھی ایک طرفہ تماشا ہے

اسے عبادت گاہوں میں محوِ نیاز دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کے ذوقِ عبودیت پر نثار اور جنت کی حوریں اس کی جھکی ہوئی پیشانی پر تصدق ہوتی ہیں۔ اس کا ایک ایک سجدہ، زمین اور آسمان کو وجد میں لاتا، اور فضائے کائنات میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔

اور اگر اسے محبت کے حریم ناز میں سربزانو دیکھو تو کسی کی یاد میں اس کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ شب کی تاریکیوں میں شمع کافوری کا کام دیں۔ آفتاب، اس کے دل کی تپش و خلش سے حرارت مستعار لیتا ہے کہ وہ اس سے نبضِ ہستی میں تموج پیدا کر دے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کے سوز و گداز سے، اپنے اندر نئی زندگی محسوس کرتا ہے۔

اور اگر اسے حیرت خانۂ علوم و فنون میں سرگرمِ تحقیق دیکھو تو اس کا فکرِ فلک پیما، زمین کی پستیوں سے آسمان کے راز فاش کرتا اور مہر و مہ دستاروں پر کمندیں ڈالتا ہے۔ وہ زہر سے تریاق بناتا اور پتھر کو آئینے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی اختراعاتِ جمیلہ، تہذیب و تمدن کے قصرِ رنگین میں، نور و نکہت کی ندیاں رواں کر دیتی ہیں۔

لیکن ــــ یہی انسان جب نشۂ قوت سے بدمست، اور ہوسِ خون آشامی سے مدہوش ہو کر، اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح امنڈتا ہے تو عبودیت کا عجز و نیاز، محبت کا سوز و گداز، اور علم و حکمت کا ساز و یراق، سب اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جاتے ہیں۔ یہ خود اپنے ہاتھوں کے تعمیر کردہ قصرِ تہذیب و تمدن کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ آباد بیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اور انسان کا خون پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو جاتا ہے۔

اس کی ساری تاریخ، اسی خوں ریزی اور آتش بازی کی ہولناک داستان ہے۔ یہ جوں جوں

علم و عقل میں آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کی تباہ کاریوں کی وسعت حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب دارائے یونان کی طرف لشکر کشائی کی تو اس کے ساتھ صرف دس ہزار فوج تھی۔ جب اسکندر نے ایشیا کی طرف رُخ کیا تو اس کے جلو میں تیس ہزار کا لشکر تھا۔ جب نپولین نے روس پر حملہ کیا تو پانچ لاکھ فوج اس کے زیر کمان تھی۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں، صرف مقتولین اور زخمیوں کی تعداد ایک کروڑ سے زائد تھی۔ اور کہا جا رہا ہے کہ اگر اب کے جنگ چھڑی تو ایک بم، پورے کے پورے کرّہ ارض کو بھک سے اڑا دے گا۔ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (۵۵/۲۷)۔ صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی۔

خوں ریزی کی وسعتیں

یہ تو انسان کی سیاسی دنیا کی داستانِ خوں ریز تھی۔ اس کی فکری دُنیا کی طرف آیئے تو وہاں بھی یہ عجیب مجموعۂ تضاد دکھائی دے گا۔ اگر ایک طرف اس نے یہ فلسفہ وضع کیا کہ ایک چیونٹی کا مارنا بھی مہاپاپ (گناہِ عظیم) ہے، اور انسان کو منہ پر کپڑا باندھے رکھنا چاہیئے، تاکہ جراثیم، سانس کے ذریعے، اندر جا کر ہلاک نہ ہو جائیں اور اسطرح انسان، چیونٹیا کے جرم کا مرتکب نہ ہو جائے، تو دوسری طرف ہم نیٹشے کے الفاظ میں یہ سنتے ہیں کہ

MEN SHOULD BE EDUEATED FOR WAR AND WOMEN FOR THE RECREATION OF THE WARRIORS. EVERYTHING ELSE IS FOLLY

مردوں کو سپاہ گری کی تعلیم دینی چاہیئے اور عورتوں کا مقصدِ زندگی، ان سپاہیوں کی تفریح کا سامان بننا۔ اس کے سوا جو کچھ ہے سب بکواس ہے۔ مسولینی کا قول تھا کہ جنگ بالکل اخلاقی چیز ہے۔ ہٹلر کہا کرتا تھا کہ اب ایک نئی دنیا وجود میں آ چکی ہے جس میں جنگ ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ جنگ ہر شے کے ماپنے کا ذریعہ ہے اور قانون وہی ہے جسے ایک سپاہی وضع کرے۔ فرد اور معاشرے کے صرف وہی کام قابلِ ستائش قرار پا سکتے ہیں جو جنگ کی تیاری میں مدد دیں۔

(HEINRICH HAUSER) کا قول ہے کہ

ہمیں چاہیئے کہ ان تمام اداروں کو توڑ ڈالیں جو انسان کو امن اور حفاظت کی ضمانت دیتے ہیں۔ زندگی صرف اسی وقت محکم اور سادہ ہو سکے گی جسے بربریت کا عہد کہا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ، اس افراط و تفریط میں، قرآن، اس سلسلہ میں، کیا فلسفہ اور مسلک پیش کرتا ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بالعموم ہر شخص امن اور سلامتی چاہتا ہے۔ جو لوگ اس سلسلہ میں

امن و سلامتی کا دین

کوئی نمایاں کام کرتے ہیں، دنیا کی ہر قوم انہیں واجب التعزیت سمجھتی اور ان کے مجسمے کھڑے کرتی ہے۔ ہر سال کسی نہ کسی کو امن (PEACE) کا نوبل پرائز دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے خدا کی ایک صفت اَلسَّلَامُ اور دوسری اَلْمُؤْمِنُ بتائی ہے۔ اَلسَّلَامُ کے معنی ہیں وہ ذات جس سے ہر شے سلامتی حاصل کرے۔ اور مُؤْمِنٌ کے معنی ہیں، امن کی ضمانت دینے والا۔ جس پر بھروسہ کر کے امن اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ خود اس نظامِ زندگی کا نام جسے قرآن پیش کرتا ہے، اسلام ہے۔ اور جن لوگوں کے ہاتھوں سلامتی کا یہ نظام متشکل ہوتا ہے، انہیں مُؤْمِنٌ کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اس ضابطۂ حیات (قرآن) کے متعلق، جو اس نظام کا آئین و دستور ہے کہتا ہے کہ یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (۵/۱۶) اس کے ذریعے خدا سلامتی کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔ وہ اس کی دعوت کے متعلق کہتا ہے کہ یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (۵/۱۶) اس کے ذریعے خدا سلامتی کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔ وہ اس کی دعوت کے متعلق کہتا ہے کہ وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ (۱۰/۲۵) خدا سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ مومنین کے مآلِ زندگی کے متعلق کہتا ہے کہ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ (۶/۱۲۸) ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے۔ وہ جس معاشرہ میں رہتے ہیں، وہ معاشرہ امن اور سلامتی کا گہوارہ ہے۔ اور اس دنیا سے جانے کے بعد، فرشتے ان کا یہ کہہ کر استقبال کرتے ہیں کہ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (۱۳/۲۴)۔ تم نے دنیا میں، امن و سلامتی قائم رکھنے کے لئے جس استقامت کا ثبوت دیا تھا، اس کے بدلے میں یہاں تمہارے لئے امن و سلامتی کے تحائف ہیں۔ یہی امن و سلامتی کی حسین آرزو ہے جو صبح سے شام تک ہر مسلمان کے وردِ زبان رہتی ہے جب وہ آنے والے کا استقبال "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کی صدائے نشاط افزا سے کرتا، اور اس کے جواب میں، وعلیکم السلام، کی نشیدِ جاں فزا سنتا ہے۔

فساد ناپسندیدہ ہے

جب معاشرہ کے امن اور سلامتی کی فضا میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو اسے "فساد" کہا جاتا ہے، جو خدا کو بے حد ناپسند ہے۔ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (۲/۲۰۵)۔ وہ انسانوں کو تاکیداً حکم دیتا ہے کہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ (۷/۵۶) زمین میں فساد مت برپا کرو۔ وہ مؤمنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا (۲۸/۸۳) ان کا مسلک، دنیا میں سرکشی اور فساد برپا کرنا نہیں ہوتا۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام، امن و سلامتی کا پیامبر ہے، اور دنیا میں فساد اور خلفشار کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اس کا منتہائے نگاہ، دنیا سے فساد ختم کر کے، عالمگیر امن اور سلامتی کی فضا پیدا کرنا ہے۔

یہاں تک تو بات صاف ہے کہ ہر شخص امن اور سلامتی میں رہنا چاہتا ہے، اور اسلام امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص دوسروں کو امن کے ساتھ نہ رہنے دے، اور معاشرہ کی سلامتی کو بگاڑنے کی کوشش کرے، تو اس وقت کیا کیا جائے؟ اس کا جواب، ہمارا ہر روز کا تجربہ اور طرزِ عمل دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص

لیکن سرکشی کا کیا علاج

اس قسم کی حرکات پہ اتر آتا ہے تو سب سے پہلے اسے سمجھایا بجھایا جاتا ہے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہیں آتا تو اسے حوالۂ پولیس کر دیا جاتا ہے، اور جب عدالت اُسے مجرم پاتی ہے تو اسے قید کر دیا جاتا ہے، تاکہ امن پسند لوگ، اس کی شر انگیزی سے محفوظ رہیں

یہ تو ہوا کسی کا انفرادی فعل۔ لیکن اگر کوئی قوم اس قسم کی حرکات کرنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج؟

عیسائیت کی مروجہ تعلیم یہ کہتی ہے کہ ایسی صورت میں چاہیئے کہ اس قوم کی زیادتی کو برداشت کیا جائے۔ اس کے سامنے ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اس کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ اسطرح وہ خود ہی نادم اور پشیمان ہو کر اپنی زیادتی سے باز آجائے گی ـــــ ایک گال پہ طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینا۔ جو شخص تمہارا کوٹ اتارے، اُسے واسکٹ خود اتار کر دے دینا۔ اس طرزِ عمل کو ظالم کی دراز دستیوں کا علاج بتایا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعلیم حضرت عیسیٰؑ کی نہیں ہو سکتی۔ یہ تجربہ پہ صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ اور خود عیسائیت

عیسائیت کی تعلیم

کی تاریخ اس کی عملاً تردید کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈین انگے (DEAN INGE) جو دنیائے عیسائیت کا ایک نامور ترجمان ہے۔ اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں لکھتا ہے۔

> عدم مدافعت کا اصول، ایک چھوٹے سے گلّے کے لئے ناموافق حالات میں زندگی بسر کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ لیکن ایک منظم سوسائٹی تشدد کے استعمال سے کبھی مجتنب نہیں رہ سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک عیسائی حکومت کو اپنے حدودِ مملکت میں کسی جرائم پیشہ گروہ کو مغلوب نہیں کرنا چاہیئے۔ اور جب اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا کرنا ضروری ہے تو پھر اس حکومت کو دشمن کے حملہ کی مدافعت کرنی بھی ضروری ہوگی۔ فتنہ و فساد کی مدافعت نہ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں جو کسی آئین و قانون کی پیروی نہیں کرتے۔ آگسٹائن کا بھی خیال تھا کہ ایسے حالات میں جنگ حق بجانب ہوتی ہے۔ ..... عدل کے بغیر سلطنت کیا ہے؟ ایک بڑے پیمانے پہ قزاقی (صفحہ ۱۷۵)

موجودہ اناجیل میں بھی بعض شہادات ایسی ملتی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ

کی حقیقی تعلیم، ایک گال پہ طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے کی نہیں تھی۔ مثلاً انجیل متی کے دسویں باب میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔

یہ نہ سمجھ کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے۔ اور بیٹی کو اس کی ماں سے۔ اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔

مہاتما گاندھی کا اہمسا

خود ہمارے زمانے میں، ہندوستان میں، مہاتما گاندھی نے اہمسا (عدم تشدد) کا پرچار بڑے شدومد سے کیا۔ اور اسے ایک خدائی فلسفۂ حیات کے طور پہ پیش کیا۔ لیکن جب ملک میں عام بدامنی پھیلی، اور عورتوں تک کی عزت خطرہ میں نظر آئی، تو انہیں مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ

بجائے اس کے کہ ہندوستان کی عورتیں محسوس کریں کہ وہ بے بس ہیں، اس سے کہیں بہتر ہے کہ انہیں ہتھیاروں کا استعمال سکھایا جائے اور عورتوں میں خنجر اور ریوالور رکھنے کا رواج ترقی پذیر ہو۔ (ہری جن بابت ۱۰/۱۹۴۶ ۲۷)

یعنی اہمسا کے پجاری کو یہاں تک کہنا پڑا کہ مرد تو ایک طرف، عورتوں کو بھی تشدد کا استعمال کرنا چاہیئے یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیش منظر، علامہ اقبالؒ نے اسی زمانے میں کہا تھا کہ

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اور اسی رشی کے چیلے، آجکل بھارت میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ اس کے پیش کردہ فلسفہ کے بطلان کی زندہ شہادت ہے۔

قرآن سطحی جذبات کو اپیل کر کے دوسروں کو وقتی طور پہ خوش اور مطمئن نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے حقائق کا سامنا کرتا، اور ان کا عملی حل پیش کرتا ہے۔

برائی کی روک تھام بھلائی سے

اس نے سب سے پہلے تلقین کی کہ جہاں تک ہو سکے، برائی کو بھلائی سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ (۴۱/۳۴)

برائی کی مدافعت نہایت حسن کار انداز سے کرو۔ اس سے یہ ممکن ہے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت ہے، وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے۔

دوسرے مقام پہ اس نے مؤمنین کی صفت یہ بتائی ہے کہ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ (۲۸/۵۴)

وہ برائی کو، بھلائی سے روکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ برتاؤ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ جن سے نادانستہ برائی سرزد ہو جائے اور شریفانہ طرزِ عمل ان پر عمدہ اثر کرے۔

جرم کی سزا

لیکن اگر اس سے کام نہ چلے، اور جس سے شرافت کا سلوک کیا جاتا ہے، وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے، تو قرآن اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس کی زیادتی کی روک تھام قوت سے کی جائے، لیکن اس کا خیال رکھا جائے کہ، سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے۔ اس کا ارشاد ہے وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ جرم کی سزا، جرم کے مطابق ہونی چاہیئے۔ لیکن یہاں بھی قرآن ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس موقعہ پر بھی دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور اگر اسے معاف کر دیا جائے تو اسکی اصلاح ہو سکتی ہے، تو ایسا کرنا بہتر ہے۔ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۴۲/۴۰) غور کیجئے! قرآن اس شخص کو بھی ظالم قرار دیتا ہے جو ایسے مجرم کو معاف نہ کرے جو اپنے کئے پر نادم ہو اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہو۔ اس سے اگلی آیت میں، اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے جہاں فرمایا کہ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ جو شخص اس ظلم کا بدلہ لیتا ہے جو اس پر کیا گیا ہو، اس پر کوئی الزام نہیں۔ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔ یہ لوگ الم انگیز سزا کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد ہے وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (۴۲/۴۱-۴۳) لیکن جو شخص دیکھے کہ عفو اور درگزر کر دینے سے، مجرم کی اصلاح ہو سکتی ہے، تو وہ اگر ہمت سے کام لے، اور مجرم کو سزا سے بچا لے تو یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

قرآنی اقدامات

آپ نے غور فرمایا کہ معاشرہ میں امن قائم رکھنے کے لئے قرآن، کیا کیا اقدامات تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

(i) دوسروں کے امن میں خلل ڈالنے والوں کو، سب سے پہلے، حسنِ سلوک سے رام کرنے کی کوشش کرو۔ ان میں اگر شرافت کا مادہ ہے تو یہ حسنِ سلوک ان کی اصلاح کر دے گا۔

(ii) اگر یہ تدبیر مؤثر ثابت نہ ہو، تو انہیں ان کے جرم کی سزا دی جائے۔ لیکن سزا، جرم سے بڑھنے نہ پائے۔

(iii) اگر دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے، اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح

امکان ہے تو اُسے معاف کر دیا جائے۔

(۱۷) لیکن جو لوگ ناحق ظلم اور زیادتی کریں، اور معاشرہ کے امن کو بگاڑیں۔ اور ان میں اصلاح کے امکانات بھی نہ ہوں، تو انہیں سزا دی جائے۔ یعنی ان کی زیادتی کی روک تھام کے لئے قوت کا استعمال کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں، السّلام اور المؤمن، خدا کی صفات بتائی ہیں، انکے ساتھ اَلْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (۵۹/۲۳)۔ کا بھی اضافہ کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ قیامِ امن و سلامتی کے لئے، بعض اوقات قوّت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

قانون کے ساتھ شمشیر کا نزول

اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تنہا قانون، امن قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ اسکے ساتھ، قوّت کی بھی ضرورت ہے۔ سورۂ حدید میں ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ۔ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا۔ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ۔ اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی نازل کیا اور میزانِ عدل بھی لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵) اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فولاد بھی پیدا کیا جس میں شدّت کی سختی ہوتی ہے اور یہ لوگوں کے لئے بڑی منفعت بخش چیز ہے کیونکہ اس کی سختی سے دنیا کا امن قائم رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

سو چا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے — کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگردار
اُس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جسمیں — پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

جس قانون کی پشت پناہ قوت نہیں، وہ قانون وعظ و نصیحت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ قانون مؤثر ہی اسی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ قوتِ نافذہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام، جو ایک نظامِ زندگی کا نام ہے، عملی شکل اختیار کرنے کے لئے، ایک آزاد مملکت کا وجود ضروری سمجھتا ہے۔ اگر اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو وہ "مذہب" بن کر رہ جاتا ہے۔ دین کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ اور اس مملکت کی حفاظت، وہ اپنا اولیں فریضہ قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اُس نے جماعتِ مؤمنین سے تاکیداً کہا ہے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ... (۸/۶۰) جہاں تک بھی تمہارے بس میں ہو، قوت پیدا کر کے اور گھوڑوں کے رسالے تیار رکھ کر، دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو اور اپنی سرحدوں کی پوری پوری حفاظت کرو، تاکہ اس طرح مستعد رہ کر، تم اپنے اور نظامِ خداوندی کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو،

اور وہ تمہاری طرف قدم بڑھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔
لیکن یہ قوت، اس مملکت کی حفاظت کے لئے ہوگی جس میں نظامِ خداوندی نے ایک عملی شکل اختیار کر کے، امنِ عالم کو قائم رکھنا ہے۔ اسے کمزور قوموں کو لوٹنے اور کچلنے کے لئے صرف نہیں کیا جائے گا۔ اس حقیقت پر قرآن کا وہ مقام شاہد ہے جہاں سب سے پہلے، مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ اُسے غور سے سُنیے۔

جنگ کی پہلی اجازت

نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین، نے تیرہ برس مکہ میں گزارے، اور مخالفین کے جور و ستم کو کامل صبر و سکون سے برداشت کیا۔ ان کی طرف سے ہر برائی کی مدافعت بھلائی سے کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس سے انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اُنکی طرف سے شدائد اور مصائب کا سلسلہ دن بدن زیادہ ہوتا چلا گیا۔ حتّٰی کہ، حق پرستوں کی اس مختصر سی جماعت نے اپنا گھر بار چھوڑ کر، دُور مدینہ میں جا کر پناہ لی۔ لیکن ان مخالفین نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا، اور تہیہ کر لیا کہ یا تو انہیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنی دعوت کو چھوڑ دیں اور یا ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر ان کے خلاف چڑھ دوڑے۔ اب اس جماعت کے سامنے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ یہ وہ مقام جب انہیں پہلی مرتبہ، میدانِ جنگ میں آنے کی اجازت دی گئی۔ سورۂ حج میں ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ یہ لوگ جن پر اس قدر مظالم کئے گئے ہیں، اب، بالآخر انہیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ گھبرائیں نہیں: وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ خدا ان کی مدد کرنے پر یقیناً قادر ہے۔ نِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ۔ ان پر مظالم اس انتہا تک پہنچ چکے تھے کہ ان بیچاروں کو ان کے گھر بار سے بھی نکال باہر کیا گیا۔ اور ناحق ایسا کیا گیا۔ ان کا جُرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب، اللہ ہے۔ اس جُرم کی پاداش میں انہیں ان کے وطن سے نکال دیا گیا، اور اب جب کہ یہ دیارِ غیر میں آ کر پناہ گزیں ہوئے ہیں تو انہیں یہاں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سرکش قوتوں کو بدلگام ہونے دیا جائے یا ان کی روک تھام کا کچھ انتظام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک بات بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ۔ اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ سرکش قوتوں کی روک تھام اور دوسرے لوگوں کے ہاتھوں ہو، تو پھر دنیا میں کوئی امن کی جگہ باقی ہی نہ رہے، حتّٰی کہ مختلف اہلِ مذاہب کی

پرستش گاہیں تک مسمار کر دی جائیں۔ راہبوں کی کوٹھڑیاں، یہودیوں کے صومعے، دیگر اقوام کی عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں خدا کا نام بکثرت لیا جاتا ہے، یہ سب ڈھا دی جائیں۔ اس مقصد کے لئے، ایسی جماعتوں کا وجود ضروری ہے جو عندالضرورت اپنی جان تک دے کر لوگوں کی مذہبی آزادی، برقرار رہنے کا انتظام کریں۔ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۲۲/۴۰-۳۹)۔ جو جماعت، اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے خدا کی مددگار بنے گی، خدا یقیناً اس کی مدد کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جماعت، جسے سرکش قوتوں کی روک تھام کے لئے جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے، اگر اُسے غلبہ حاصل ہو گیا تو اس کا طرزِ عمل کیا ہو گا؟ کیا اس کا غلبہ بھی اسی طرح، کمزوروں اور ناتوانوں کو کچلنے کے لئے ہو گا؟ قطعاً نہیں۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں تمکن حاصل ہو گیا تو یہ ایسا نظام قائم کریں گے جس میں لوگ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں گے، اور ہر شخص کو سامانِ نشوونما حاصل ہو گا۔ یہ ان باتوں کا حکم دیں گے جنہیں خدا کا قانون صحیح قرار دے گا اور ان سے روکیں گے جنہیں وہ ناپسندیدہ کہے گا۔ ان کی حکومت میں، ہر معاملہ کا آخری فیصلہ، قانونِ خداوندی کے مطابق ہو گا۔ لہٰذا، اس میں کسی قسم کی سرکشی اور دھاندلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔

اسلامی مملکت کی غرض و غایت

دوسرے مقام پر کہا گیا کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ اگر اللہ سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا رہے، تو دنیا میں فساد ہی فساد نظر آئے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۲۵۱) لیکن خدا اس طرح اقوامِ عالم کو تباہ نہیں کرانا چاہتا اس لئے اس نے ایسی جماعتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اپنا خون دے کر، امنِ عالم قائم رکھیں۔

لہٰذا، قرآنِ کریم کی رُو سے، جنگ کی اجازت ان لوگوں کو دی گئی ہے جنہیں سرکش قوتیں کہیں جینے نہ دیں۔ وہ ان قوتوں سے مدافعت کے لئے جنگ کر سکتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان بچاروں میں اتنی سکت نہ ہو کہ یہ اپنی مدافعت کر سکیں تو پھر کیا ہو؟ کیا کیا اس صورت میں انہیں، اُن جفاجُو درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ ان مظلوموں اور لاوارثوں کی مدد کی جائے اور ان کی حفاظت کے لئے عندالضرورت، میدانِ جنگ میں اترا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جماعتِ مومنین سے کہا جاتا ہے کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ

مظلوموں کی مدد کیلئے

وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ج
تم سنتے نہیں کہ کمزور اور ناتواں مرد، عورتیں، بچے کس طرح چلا چلا کر پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے
رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندوں نے اس قدر ظلم برپا کر رکھا ہے۔
وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ج وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (۴/۷۵) وہ فریاد کر رہے
ہیں کہ ہمارے لئے کہیں سے کوئی سرپرست پیدا کر دے۔ کوئی مددگار بھیج دے جو ہمیں ان کے
مظالم سے نجات دلائے۔ کیا انکی فریاد تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی، یا تم نے سمجھ لیا ہے
کہ چونکہ اب ہم محفوظ ہو گئے ہیں اس لئے ہمیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ تمہارا
مقصد زندگی اپنی جان کی حفاظت ہی نہیں بلکہ دنیا میں ہر مظلوم کی حفاظت ہے۔ ظلم کی روک تھام
تمہارا فریضۂ زندگی ہے۔ اس لئے جہاں سے مظلوم کی آواز اٹھے گی، تمہیں اس کی مدد
کے لئے پہنچنا ہوگا۔ یہی جنگ "قتال فی سبیل اللہ" اللہ کی راہ میں جنگ ہے۔ اَلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ج وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (۴/۷۶)
جماعتِ مومنین، ظلم کی روک تھام کے لئے، خدا کی راہ میں جنگ کرتی ہے۔ اور جو لوگ
حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں، وہ ظلم اور سرکشی کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ قرآن کریم
نے یہاں جنگ کے مقاصد میں اصولی اور بنیادی فرق بتا کر، یہ واضح کر دیا کہ کس مقصد

جائز اور ناجائز جنگ

کے لئے جنگ، جائز بلکہ ضروری ہو جاتی ہے، اور کن مقاصد کے لئے ناجائز اور باطل۔ اگر جنگ، ظلم مٹانے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لئے ہو تو جائز۔ اگر ظلم برپا کرنے کے لئے ہو تو ناجائز۔ ظلم کسے کہتے ہیں، اسے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر نہایت وضاحت سے خود ہی بیان کر دیا ہے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی گروہ، کسی بات کو یونہی ظلم قرار دے کر، آمادۂ پیکار ہو جائے اور اپنے آپکو برسرِ حق قرار دے لے۔ قرآن اپنی کسی بات کو مبہم اور وضاحت طلب چھوڑتا ہی نہیں۔ لیکن یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق، میں مختلف مواقع پر بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ اس مقام پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ جن امور کو قرآن "بنیادی حقوقِ انسانیت" قرار دیتا ہے کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو ان سے محروم کر دینا، ظلم قرار پائے گا۔ اور اس کی روک تھام جماعتِ مومنین کا فریضہ ہوگا، خواہ یہ ظلم کسی پر بھی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں ہوگی۔

یہاں تک سوال، جنگ کی ضرورت، مقاصد، جواز یا عدمِ جواز کا تھا۔ اب یہ دیکھئے کہ جنگ کی صورت میں، قرآن، جماعتِ مومنین پر کن شرائط کی پابندی ضروری قرار دیتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ عدل کا دامن، جنگ میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا جائے گا۔ دشمن سے بھی

دشمن سے عدل عدل کیا جائے گا۔ اس کا تاکیدی حکم ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۵/۸) دیکھنا! کسی قوم کی تمہارے خلاف دشمنی، تمہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ دشمن سے بھی عدل کرو۔ یہی طرزِ عمل تقویٰ سے قریب تر ہے۔ عدل ظلم کی ضد ہے۔ لہٰذا، جب ظلم کے معنی ہیں، کسی کو انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم کر دینا، تو عدل سے مراد ہو گی، ان حقوق کی حفاظت کرنا۔ بنا بریں، قرآن کریم کی رُو سے، جنگ کی حالت میں بھی دشمن کو حقوقِ انسانیت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کا عام چلن یہ ہے کہ جنگ اور معاشقہ میں ہر حربہ جائز ہے (EVERY THING IS FAIR IN LOVE AND WAR) لیکن قرآن اسے حدیثِ بے خبراں قرار دیتا ہے اس کے نزدیک، عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دینا، جنگ میں بھی جائز نہیں۔

اب آگے بڑھیئے۔ جنگ ہو یا صلح، ان میں معاہدات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

معاہدات کی اہمیت حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا امن، معاہدات کے بھروسے پر قائم رہتا ہے۔ معاہدہ باہمی اعتماد کی ضمانت ہوتا ہے۔ لیکن جب اصول یہ قرار دے لیا جائے کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے، تو پھر معاہدات کا احترام کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونان کے مشہور مقنن، سولن نے کہا تھا کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو تو پھانس لیتا ہے لیکن قوت والے کے سامنے پرِ کاہ کی سی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور مغربی سیاست کا امام، میکیاولی یہ تعلیم دیتا ہے کہ

> عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی عہد یا پیمان اس کے خلاف جاتا ہے یا جن مصلحتوں کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہیں، تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نظر فریب دلائل بھی بہم پہنچائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ فریب جس سے مقصد حاصل ہو، قابلِ تعریف ہوتا ہے۔

اور اس امام کے مقتدی، فریڈرک دوم کا قول ہے کہ

> حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمت عملی یہ کہ حسبِ موقعہ، جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے، اسے اختیار کر لیا جائے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری سلطنتوں سے معاہدات کر کے اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینے چاہئیں۔ اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہیئے۔ اگر کبھی کسی سے معاہدہ کر بھی لیا جائے تو اسے حسبِ مصلحت توڑ ڈالنا چاہیئے۔

اٹلی کے میکیاولی سے بہت پہلے، بھارت (ہندوستان) میں ایک میکیاولی گزرا ہے جس کا لقب ہی

کوٹلیہ (KAUTILYA) - یعنی فریب کار - ہے - وہ اپنی کتاب، ارتھ شاستر میں لکھتا ہے کہ معاہدات کو وقتی مصلحتوں کے تابع رہنا چاہیئے اور عندالضرورت ان سے بلا توقف پھر جانا چاہیئے - لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے کرنا چاہیئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں سے کسی کو تمہاری چال کا علم نہ ہونے پائے[1]

معاہدہ کا احترام

ان سب کے برعکس، قرآن کریم نے معاہدات کی پابندی پر جس قدر زور دیا ہے، اس پر اس کا ایک ایک متعلقہ مقام شاہد ہے - اس نے اصولی تاکید کی کہ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵/۱) عہد و پیمان کی پوری پوری پابندی کرو - دوسرے مقام پر ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ معاہدہ کرنے کے بعد تم ایفائے عہد کے لئے، صرف اس پارٹی کے سامنے جوابدہ ہو جس کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہے - تم اس کے لئے اپنے خدا کے سامنے بھی جوابدہ ہو - اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴) عہد کی پابندی کرو - یاد رکھو! تم سے عہد و پیمان کے متعلق پوچھا جائے گا -

قرآن کے ان تاکیدی احکام کی روشنی میں، جماعت مومنین کی طرف سے، معاہدات میں خیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے بڑھتا ہے - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فریق مخالف، خیانت پر اتر آئے، تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب عام طور پر یہی دیا جائے گا کہ پھر تم بھی اسی قسم کا طرز عمل اختیار کرو - لیکن قرآن کی یہ تعلیم نہیں - وہ کہتا ہے کہ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً اگر تمہیں کسی پارٹی کی طرف سے عہد شکنی کا خطرہ ہو تو تم انہیں اطلاع دیئے بغیر، یونہی معاہدہ کالعدم نہ کر ڈالو - فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ تم انہیں اس کی اطلاع دے کر معاہدہ ختم کرو - اور اس طرح دونوں فریق برابر کی سطح پر آجاؤ - عَلٰى سَوَآءٍ کے یہ معنی بھی ہیں کہ اگر اس طرح یک لخت معاہدہ توڑنے سے انہیں کوئی نقصان پہنچتا ہو تو اسکی تلافی کر کے، ان سے مساوات کا سلوک کرو - اس لئے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (۸/۵۹) اللہ معاہدات میں خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا -

عملی مثالیں

ہماری تاریخ کے اس عہد ہمایوں میں، جب قرآنی نظام قائم تھا، کسی بین الاقوامی معاہدہ میں خیانت کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا - اُس زمانے میں، انفرادی عہد و پیمان کا بھی کس حد تک احترام کیا جاتا تھا - اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے - بدر کے میدان میں حالت یہ تھی کہ ادھر، تین سو تیرہ، قریب قریب نہتے اور بے ساز و یراق مجاہدین کی

---

[1] ہندوستان، اپنے اس سیاسی گرو کے ایڈیشن (نصیحت) پر کس طرح حرفاً حرفاً عمل کر رہا ہے، اس پر اس کی پندرہ سولہ سال کی سیاسی تاریخ شاہد ہے - اور ایک ہندوستان پر ہی کیا موقوف ہے - دنیا کا ہر ملک یہی کچھ کر رہا ہے -

صف ۔ مقابل میں قریش کا جم غفیر۔ اتنے میں دیکھا کہ دو صحابیؓ، کہیں سے دوڑے دوڑے آئے اور مجاہدین کی صفوں میں شریک ہو گئے۔ اُس وقت حالات ایسے نازک تھے کہ اسلامی لشکر میں ایک سپاہی کا اضافہ بھی موجب تقویت تھا۔ مجاہدین کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ حضورؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی اور طرف سے آ رہے تھے۔ راستے میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کے لئے جا رہے ہو۔ انہوں نے انکار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس جہاد میں شرکت نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ میدانِ جنگ تک پہنچ سکے ہیں۔ حضورؐ نے سنا تو فرمایا کہ جب تم نے ان سے جنگ میں عدم شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ فکر نہ کرو۔ ہماری اللہ مدد کرے گا۔

یہ تو پھر بھی ایسے عہد کی پابندی ہے جو، بہ حالات مجبوری ہی سہی، مخالفین سے کر لیا گیا تھا۔ قرآن کریم اس باب میں اس سے بھی دو قدم آگے جاتا ہے۔ ہجرت کے بعد، ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ بعض عورتیں مسلمان ہو گئیں۔ لیکن ان کے خاوند، ہنوز غیر مسلم تھے۔ ان کفار کی طرف سے ان مسلمان بیویوں پر جو مظالم ہوتے ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ یہ عورتیں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر، کسی نہ کسی طرح، ہجرت کر کے مدینہ میں آ جاتی تھیں۔ اور اس طرح ان کے مظالم سے چھٹکارا حاصل کر لیتی تھیں۔ ان عورتوں کے متعلق قرآن نے کہا کہ انہیں واپس تو نہ بھیجو کیونکہ ان حالات میں، ان مسلم عورتوں کا، اُن کفار کے نکاح میں رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن وَآتُوهُم مَّا أَنفَقُوا (۶۰/۱۰) انہوں نے ان کے نکاح پر جو کچھ خرچ کیا تھا، وہ انہیں ادا کر دو۔ غور کیجئے! آپ کو ایفائے عہد اور عدل و انصاف کی، اس قسم کی مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے، جس قوم سے جنگ چھڑ جائے، اس جنگ کو کب تک جاری رکھا جائے؟ قرآن نے کہا ہے کہ وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ۔

صُلح

فریقِ مخالف جس وقت بھی صُلح کی طرف جُھکے تم اس کی طرف جُھک جاؤ۔ اس وقت یہ نہ کہو کہ ہماری فتح ہونے لگی تھی تو دشمن نے صلح کی درخواست پیش کر دی۔ اب ہم صُلح کیوں کریں۔ ہم انہیں مفتوح و مغلوب بنائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اندازِ نگاہ غلط ہے۔ جنگ سے تمہارا مقصد نہ مالِ غنیمت تھا نہ کشور کشائی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ سرکش قوتیں اپنی سرکشی سے باز آ جائیں۔ سو وہ جس وقت بھی سرکشی چھوڑ کر، قانون کے سامنے جُھک جائیں، تمہارا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد جنگ جاری رکھنے کے معنی کیا ہیں؟ وَإِن يُرِيدُوا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ (۸/۶۲)۔ اگر بفرضِ محال، وہ صُلح کی درخواست کی آڑ میں تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہوں، تو تمہیں پھر بھی گھبرانا نہیں چاہیئے۔ قانونِ خداوندی تمہاری حفاظت کے لئے کافی ہے۔ تم اپنی طرف سے پوری پوری احتیاطی تدابیر اختیار کرو۔ لیکن ان کی صُلح کی درخواست کو اس بدگمانی کے ماتحت مسترد نہ کر دو

وہ اس باب میں نیک نیتی سے کام نہیں لے رہے۔

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ صلح کے لئے آمادہ نہ ہوں، تو جنگ کب تک

جنگ کب تک جاری رکھی جائے

جاری رکھی جائے۔ اس کے لئے کہہ دیا کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (۸/۳۹)۔ جب تمہیں یقین ہو جائے کہ وہ فتنہ فرو ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ جنگ کی گئی تھی، تو جنگ ختم کر دو۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، جنگ سے مقصد فتنہ ختم کرنا تھا۔ لفظ فتنہ کے اندر ہر قسم کی سرکشی۔ استبداد۔ جور و ستم۔ مذہب کے معاملہ میں سختی اور زبردستی آ جاتے ہیں۔ یہ تو رہا صلح کی صورت میں، یا فتنہ فرو ہو جانے کی شکل میں جنگ کا اختتام۔ لیکن قرآن کریم، جنگ کے دوران میں، امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو وجد میں آ جاتی ہے۔

جنگ کا التوا

جنگ اسی صورت میں جاری رکھی جا سکتی ہے کہ فریقین اپنی اپنی قوم اور سپاہیوں کے دل میں، فریق مخالف کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات برابر مشتعل کرتے رہیں۔ اگر کسی طرح جنگ میں وقفہ پیدا کر دیا جائے، تو جذبات کا یہ اشتعال مدھم پڑ جاتا اور پھر ختم ہی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ اس آگ کو بھڑکانا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے ہمارے زمانہ میں متارکہ (CEASE — FIRE) کا طریق وضع کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے، آج سے بہت پہلے، متارکہ کے اصول کو قوانین جنگ کے ضابطہ میں داخل کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ بین الاقوامی معاہدہ کی رُو سے، یہ طے کر لینا چاہیئے کہ، سال میں کچھ مہینے ایسے رکھے جائیں گے جن میں جنگ بہر حال ملتوی کر دینی ہوگی، خواہ وہ کہیں بھی ہو رہی ہو، مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (۹/۳۶)۔ سال کے بارہ مہینوں میں چار ایسے ہیں جن میں لڑائی یکسر بند رہے گی۔ ظاہر ہے کہ جب، سال میں کچھ وقت کے لئے لڑائی بہر حال بند ہو گی تو جذباتِ منافرت و عداوت کی آگ کی شعلہ زنی خود بخود ماند پڑ جائے گی اور یہ فضا قیامِ امن و صلح کے لئے بڑی سازگار ہو گی۔

جنگ کے قیدی

جنگ کے سلسلے میں ایک اہم سوال جنگ کے قیدیوں کا ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ روش، زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی تھی کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت، عربوں میں یہی رواج تھا۔ چنانچہ ان کے معاشرہ میں، غلام اور لونڈیاں عام ملتی تھیں اور اسے ذرا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے آ کر یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ کسی انسان کو غلام بنا لینا، اسے حقِ انسانیت سے محروم کر دینا ہے، جو بہت بڑا جرم ہے۔ اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ۔ جب مخالفین سے

تمہارا مقابلہ ہو، تو جیسا کہ جنگ میں ہوتا ہے، ان کی سرکوبی کرو۔ حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ۔ پھر جب وہ مغلوب ہو جائیں تو انہیں قید کر لو۔ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (۴۷/۴) اس کے بعد، یا تو انہیں بطور احسان چھوڑ دو۔ اور یا فدیہ لے کر۔ آپ دیکھئے کہ بات کسقدر صاف ہے۔ جنگ کے قیدیوں کو آزاد کرنا ہوگا۔ اگر تمہارے قیدی دشمن کے ہاں ہیں، تو ان کے مبادلہ میں انہیں رہا کر دو، یا کچھ زرِ فدیہ لے کر۔ اور یا محض احسان کے طور پر انہیں آزاد کر دو۔ بہر حال انہیں آزاد کرنا ہے۔ جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں یہی ایک آیت ہے۔ اس میں آپ دیکھئے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنا لینے کا اشارہ تک نہیں۔ اور ایسا ہو بھی کسطرح سکتا تھا۔ وہ قرآن جو فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳)۔ یعنی غلاموں کو آزاد کرانے کو، جماعتِ مومنین کا فریضہ قرار دیتا ہے، جو جنگ کی ضرورت ہی اس لئے قرار دیتا ہے کہ جن لوگوں کو حقوقِ انسانیت سے محروم کر دیا گیا ہے، انہیں وہ حقوق واپس دلائے جائیں۔ جو واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا غلام اور محکوم بنائے۔ کیا وہ قرآن اسکا حکم دے گا کہ جنگ میں قید ہونے والے انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح بیچا جائے! سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون جب تک جنگ کے قیدی، نظامِ اسلامی کی تحویل میں رہیں گے، ان کی حیثیت سرکاری مہمانوں کی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ قیدی ہو کر بھی انسان تو رہتے ہیں اس لئے انہیں حقوقِ انسانیت سے کسی صورت میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران میں ان سے کس قسم کا سلوک ہوگا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جنگ بدر کے قیدیوں میں ایک شخص ابو عزیز تھا۔ اس کا بیان ہے کہ میں جس انصاری کے گھر میں بطور مہمان رکھا گیا تھا ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح شام کھانا لاتے، تو کھانا میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گزارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا، لیکن وہ اُسے ہاتھ نہ لگاتے، اور زبردستی مجھے کھلا دیتے۔

انہیں قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمر تھا جو فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے، عام مجمعوں میں، نبی اکرمؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس شخص کے سامنے دو دانت اکھڑوا دیئے جائیں تاکہ یہ آئندہ تقریر کرنے کے قابل نہ رہے۔ لیکن حضورؐ نے اس کی اجازت نہ دی۔

جنگ بدر کے قیدیوں کو زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جو ناداری کی وجہ سے زرِ فدیہ نہ دے سکے، ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ یہی ان کا فدیہ ہو جائے گا۔ جو ایسا بھی نہیں کر سکتے تھے، انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔ جن سے زرِ فدیہ لیا گیا تھا، ان سے بھی جاتے وقت کہہ دیا گیا کہ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ (۸/۷۰) اگر اس کے بعد، اس مملکت کے متعلق تمہارے

دل میں خیر سگالی کے جذبات پائے گئے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، تمہیں اس سے بہتر واپس دیا جائے گا اور تمہاری حفاظت کا سامان بھی کر دیا جائے گا۔

"غلامی اور اسلام" ایک مستقل موضوع ہے۔ جس پر تفصیل سے گفتگو کسی دوسرے وقت کی جا سکے گی۔ اس مقام پر ضمناً اتنا واضح کر دینا کافی ہوگا کہ قرآنِ کریم میں، غلاموں اور لونڈیوں (مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) کے ضمن میں جس قدر احکام اور ہدایات ہیں، وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام احکام ماضی کے صیغے (PAST TENSE) میں ہیں۔ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ یعنی جو اس سے پہلے، غلام بنائے جا چکے تھے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ جنہیں تم اس کے بعد غلام بناؤ، ان کے متعلق یہ احکام ہیں۔ قرآن نے اُن غلاموں اور لونڈیوں کو جو اس وقت اس معاشرہ میں موجود تھے، آہستہ آہستہ یا آزاد کرا دیا اور یا انہیں مختلف خاندانوں کا جزو بنا دیا۔ اور اس کے بعد غلامی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ لیکن اس بدقسمتی کا کیا علاج کہ ہمارے اربابِ مذہب، اب بھی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اسلام میں دشمن کے قیدیوں کو غلام اور انکی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کی اجازت ہے۔ اور اگر اب بھی پاکستان کی جنگ کسی اور ملک سے ہوئی تو ہم ان کے مردوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

> حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کر دے، چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں۔ اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔ (تفہیم القرآن۔ از ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ص ۳۴۰)

اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

> جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو۔ بہرحال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصے میں وہ آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔
>
> (تفسیر تفہیم القرآن۔ صفحہ ۳۴۰)

یعنی نکاح تو صرف مسلمان عورتوں سے یا اہلِ کتاب کی عورتوں سے ہو سکتا ہے، کفار اور مشرکین کی عورتوں سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ لیکن جنگ میں گرفتار شدہ لونڈیوں کے لئے یہ بھی شرط نہیں کہ وہ اہل کتاب سے ہوں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

> جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے اس طرح لونڈیوں

کی تعداد پر نہیں لگائی۔

حتیٰ کہ جن لوگوں کے حصے میں یہ لونڈیاں آئیں گی انہیں اس کا بھی اختیار ہوگا کہ استعمال کرنے کے بعد انہیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ چنانچہ اس باب میں تحریر ہے کہ

اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت در اصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۳۲۳)

یہ ہے جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں اور ان کی عورتوں کے ساتھ وہ سلوک جسے ہمارے یہ حضرات اسلام کا منشاء اور حکم قرار دے کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں[1]۔

بہرحال، یہ بات ضمناً سامنے آگئی تھی۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآن نے حکم یہ دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر رہا کر دو اور یا بطور احسان۔

یہ تو ان لوگوں کے متعلق ہے جو مغلوب و مفتوح ہو کر گرفتار ہو جائیں۔ لیکن جو لوگ مسلمانوں کی پناہ میں آنا چاہیں، ان کے متعلق قرآن کا فیصلہ، اسکی کشادہ نگہی کی زندہ شہادت ہے۔ آج کل ایک نئی ٹیکنیک رائج ہوئی ہے جسے (BRAIN WASHING) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو شخص تمہارے قابو آجائے ـــ خواہ وہ تمہارے اپنے لوگوں میں سے ہو اور اس کے خلاف کوئی بدگمانی ہو، یا دشمن کا کوئی آدمی ـــ اسے دردناک عذاب کی بھٹیوں میں سے اس طرح گزارو کہ اس کے تمام سابقہ خیالات اس کے دماغ سے محو ہو جائیں اور وہ اسی طرح سوچنے لگ جائے جس طرح تم چاہو۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ اور اگر مخالفین (مشرکین) میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اسے اپنے ہاں پناہ دو۔ پھر اسے قرآن سناؤ۔ اگر قرآن کی تعلیم اسے اپیل کرے اور وہ دل کے کامل اطمینان اور سکون کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہے تو خیر۔ لیکن اگر وہ اس کے بعد چلا جانا چاہے تو اُسے روکو نہیں، بلکہ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ اسے، اپنی حفاظت میں، اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۹/۶) اس لئے کہ یہ لوگ جاہل ہیں۔ جانتے نہیں کہ قرآن انہیں

پناہ میں آنے والے

---

[1] تفصیل ان امور کی، ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قتل مرتد اور غلام اور لونڈیاں" میں ملے گی۔

کیا مقام دینا چاہتا ہے۔ لیکن قرآن کسی سے زبردستی نہیں منوایا جاتا۔ اس لئے اگر یہ بطیب خاطر، قرآن کو ماننا نہیں چاہتے، تو انہیں، اپنی حفاظت میں، ان کے مامن تک پہنچا دو ____ آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن کی تعلیم کسقدر بلند اور انسانیت ساز ہے؟ اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا قرآن کریم جنگ کو انسان کی تمدنی زندگی کے لئے

جنگ کا خاتمہ

لاینفک قرار دیتا ہے یا ایسے معاشرہ کا بھی تصور دیتا ہے جس میں جنگ کا امکان نہ رہے۔ وہ ایسے معاشرہ کا تصور دیتا ہے جو آیت اوپر درج کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب تمہیں حق کی مدافعت کے لئے میدانِ جنگ میں نکلنا پڑے تو دشمن کی سرکوبی کرو۔ اور جب انکی طاقت ٹوٹ جائے تو بقیۃ السیف کو قید کر لو۔ اور قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہے حتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷/۴) تا انکہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ قرآن جس جنتی معاشرہ کا تصور پیش کرتا ہے اس میں ہر طرف سے سلاماً سلاماً کی زندگی بخش اور امن افروز صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس میں ہر انسان، دوسرے انسان کی سلامتی کا آرزومند ہوتا ہے۔ وہ ایسی انسانیت ساز فضا کسطرح پیدا کرتا ہے جس میں بدامنی کا خدشہ تک نہ ہو، ایک الگ موضوع ہے جو تفصیل چاہتا ہے۔ اُسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ وہ اُن غیر فطری حدود و خطوط کو مٹا کر، جن کی بنا پر انسان مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ رہا ہے، تمام انسانوں کی ایک عالمگیر برادری متشکل کر دینا چاہتا ہے اور اس کی بنیاد ایک مشترکہ آئیڈیالوجی قرار دیتا ہے جسے دنیا کا ہر انسان علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرے۔ جب تک ایسی فضا پیدا نہ ہو، وہ ان سرکش قوتوں کے مقابلہ کے لئے جو دوسروں پر ظلم کریں، جنگ کو ناگزیر قرار دیتا ہے ____ خواہ یہ ظلم جماعتِ مومنین کے خلاف ہو، یا دنیا کے کسی اور انسان یا انسانوں کے گروہ کے خلاف۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے جنگ کا مقصود، دنیا سے ظلم مٹا کر اس کی جگہ نظامِ عدل و احسان قائم کرنا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ترمذی کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے حق کے سامنے جھکا دیا جائے۔ اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا کہ ایک

مثلاً قرآن تو پناہ گزین مشرک کے متعلق یہ حکم دیتا ہے کہ اگر وہ قرآن سننے کے بعد، اسے برضا و رغبت تسلیم نہ کرنا چاہے تو اُسے کچھ نہ کہو۔ اسے اپنی حفاظت میں، اس کے ہاں پہنچا دو۔ اس کے برعکس ہمارے اربابِ شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان ان باتوں سے مطمئن نہ ہو جنہیں وہ اسلام کہہ کر منوانا چاہتے ہیں، اور اس لئے وہ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ (اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں)۔

اس کی عملی شکل

شخص مالِ غنیمت کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص شہرت کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص بہادری کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص ذاتی انتقام کے لئے لڑتا ہے۔ ان میں سے کس کا جہاد صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَاءَ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

جو اس لئے لڑتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون غالب رہے، اس کی جنگ، اللہ کی راہ میں ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین، صرف اپنے گروہ کے مفاد کا تحفظ کرتے ہیں۔ اور چونکہ انسان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے باہمی مفاد میں تصادم ہوتا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے۔ خدا، رب العالمین۔ تمام انسانوں کا یکساں نشوونما دینے والا ہے، اس لئے اس کے عطا کردہ قوانین کی رُو سے، تمام انسانوں کے مفاد کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر امنِ عالم کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اس بنیاد کو توحید کہا جاتا ہے یعنی تمام انسانوں پر ایک خدا کے قوانین کا اقتدار۔ جو نظام اس بنیاد پر متشکل ہوتا ہے، اسے قرآن کریم دین کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی تمام انسانوں کے لئے ایک نظامِ زندگی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس، اب، رفتہ رفتہ، خود مغرب کے مفکرین کو بھی ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً پروفیسر الفریڈ کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں، عصرِ حاضر کے ہمہ گیر اضطراب پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد، آخر میں لکھتا ہے کہ

دنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آ رہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے۔

مسٹر ایمری ریوز (EMREY REVES) اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

کھلے کھلے الفاظ میں، بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد، انسان لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح، جمہوری انداز سے اس اقتدارِ واحد کی تشکیل کریں۔ اسکے لئے، ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہیئے جن پر یہ اقتدار قائم ہوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیئے تاکہ یہ مقصود خوں ریزی کے بغیر حاصل ہو جائے

(ANATOMY OF PEACE)

یہ خیال اب دنیا کے چیدہ چیدہ مفکرین تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ مسٹر (W-A-GAULD) نے اپنی کتاب (MAN, NATURE & TIME) میں کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا کہ

مجھے تسلیم ہے کہ "گھر اور وطن" کا خیال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ایک عالمگیر انسانی معاشرہ کی رکنیت کا تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے

ابھی تک اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس کچھ زیادہ شدّت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا، اس لئے اس کے متعلق زیادہ حسن ظن قبل از وقت ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت کہ کم و بیش ہر ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رہا ہے، اس امر کی ضمانت ہے کہ کچھ وقت کے بعد، یہ خیال عملی شکل اختیار کر لے گا۔

اگر اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس زیادہ شدّت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا، تو اس کی ذمہ دار (لہٰذا، انسانیت کی بارگاہ میں مجرم) وہ قوم ہے جسے اس عالمگیر نظام کا تصوّر، آج سے چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا، قرآن نے اس زمانے میں کہا تھا کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) انسانی معاشرہ کی آخری شکل یہی ہونی ہے کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری بن جائیں۔ اس کے علاوہ، دنیا میں امن و سلامتی کی کوئی صورت نہیں۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے تمام نوعِ انسان کے لئے دین — یعنی نظامِ زندگی — بھی ایک تجویز کیا گیا۔ قرآن سے پہلے، مختلف انبیاء کرامؑ کسی خاص قوموں کی طرف آتے تھے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہوا کہ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (۷/۱۵۸) ان سے کہہ دو کہ میں تمام نوعِ انسان کی طرف رسول ہوں۔ یہی وہ بنیاد ہے، جس پر انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ خود قرآن کریم کے متعلق بھی کہا گیا کہ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ (۱۰/۵۷) اے ساری دنیا کے انسانو! تمہارے پاس خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات آگیا ہے جس میں تمہاری تمام الجھنوں کا علاج ہے۔ انسانی مشکلات کا علاج ہی یہ ہے کہ تمام انسان ایک برادری کی شکل میں زندگی بسر کریں اور اس کا طریق یہ ہے کہ ان سب کا ضابطۂ قوانین ایک ہو۔ یہ تھا وہ تصوّرِ حیات جو امّتِ مسلمہ کو چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا، لیکن اس نے اس تصوّر کو اس طرح پسِ پشت ڈال رکھا ہے کہ آج جبکہ دنیا کی دیگر اقوام کے دل میں یہ خیال، کسی نہ کسی انداز سے کروٹیں لے رہا ہے، یہ اس سے اس طرح بے بہرہ ہے گویا اس کی آواز تک کبھی اس کے کانوں میں نہیں پڑی تھی لیکن قرآن کے ان تصوّرات پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری تھوڑی ہے کہ کوئی دوسرا ان میں شریک نہیں ہو سکتا؟ یہ تو سورج کی روشنی کی طرح، فضائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس کا جی چاہے ان سے بہرہ یاب ہو جائے۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

اس نظام کا گہوارہ

پاکستان کا خطۂ زمین اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہ اس عالمگیر نظامِ انسانیت کا اولیں گہوارہ بنے اور یہاں سے اس شجرِ طیّب کی شاخیں پھوٹیں جو دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں پر، امن و سلامتی کا سایہ کریں۔ یہی وہ نظام تھا جس کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (۳/۹۷) جو اس میں داخل ہو گیا،

اسے امن نصیب ہو جائے گا۔ اور جس کی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ (۵/۹۷)۔ یہ انسانیت کے قیام کا باعث ہے۔ یہی وہ امنِ عالم کی ضمانت دینے والا نظام ہے کہ اگر سرکش قوتیں، عالمگیر مفادِ انسانیت کے خلاف، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر، اس کے قیام کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جائیں، تو انہیں راستے سے ہٹایا جائے اور اس کے لئے اگر جنگ ناگزیر ہو تو اسے اسی طرح روا رکھا جائے جس طرح، ڈاکٹر ایسی انگلی کو مجبوراً کاٹ ڈالتا ہے جس کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہو، اور جس کا زہر، سارے جسم میں سرایت کئے جا رہا ہو۔ قرآن، قوت کے استعمال کی اسی مقصد کے لئے اجازت دیتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے — صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر — ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

دین کی حفاظت" سے مراد ہی عالمگیر انسانیت کے نظامِ امن و سلامتی کی حفاظت ہے۔ اسلام میں اسی مقصد کے لئے جنگ کی اجازت ہے۔ جو جنگ، استبداد اور جوع الارض کی تسکین کے لئے کی جائے، وہ جنگ حرام ہے: ؎

صلح شر گردد چو مقصود است غیر — گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند — جنگ باشد قوم را ناارجمند (اقبالؒ)

سلیم کے نام (جلد سوم)
شائع ہو گئی

پرویزؒ صاحب نے شروع ہی سے، اپنی قرآنی فکر و پیغام کا اولین مخاطب، قوم کے نوجوان، تعلیمیافتہ طبقہ کو قرار دیا ہے کیونکہ (بقول انکے) اسی طبقہ کے بگڑنے سے قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے، سنورتی۔ اس طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح انقلاب پیدا کرنے کیلئے انہوں نے، ایک سنجیدہ، شگفتہ، دلآویز سلسلہ شروع کیا جسے "سلیم کے نام خطوط" سے تعبیر کیا گیا۔ ان خطوط نے فی الواقعہ قوم کے نوجوان طبقہ کی ذہنیت بدل دی۔ ان خطوط میں ان کا انداز بالکل مختلف ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ایک مشفق باپ اپنے ہونہار، عزیز بچوں سے باتیں کر رہا ہو۔ اسی لئے انکے یہ خطوط نوجوان طالب علموں کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔

جلد سوم ۴۰۰ صفحات قیمت -/۴۰ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور۔

مولانا حافظ غلام مرشدؒ

آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ ویدک دور میں وید کا پڑھنے پڑھانے کا کام صرف برہمن کا تھا اگر کوئی شودر یا ویشیہ وید کی آواز سن لیتا تو اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔ آج اس بیسویں صدی میں بھی وید تک رسائی ایک عام ہندو کو قطعاً حاصل نہیں۔ اچھوت بیچارا کیا ہاتھ لگائے گا۔ بھارت کی سیکولر سٹیٹ میں اقلیت کے ساتھ جو سلوک اس سائنسی دور میں روا رکھا گیا ہے۔ اخبارات و رسائل سے اسکی حقیقت بالکل واضح اور ظاہر ہے۔

جنابِ مسیح علیہ السلام کی دعوت کے ظہور سے لیکن پہلی ۵ صدی عیسوی تک انجیلِ مقدس کا کام صرف پادری صاحبان تک محدود تھا۔ عام آدمی اس کو پڑھنے کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ کتابوں کو زنجیر لگا کر کمروں میں رکھا جاتا تھا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی خصوصیت یہ بھی تھی۔ کہ انسان کو علم و روشنی سے شناسا کیا جائے۔ (قرآن پاک کی پہلی وحی علم کے متعلق ہے)۔ قرآن کریم کی دعوت یہ ہے کہ "یہ وہ کتاب ہے۔ جو اس لئے اتاری گئی کہ تم لوگوں کو اندھیروں سے نکالے اور روشنی میں لے جائے"۔ (قرآن کریم۔ سورۃ ابراہیم آیت نمبر ۱) اسی نسبت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سراجِ منیر۔ آپ کے ماننے والوں کو نور والے کہا گیا کہ وہ جہالت۔ ظلم اور طغیان کو دُور کرتے اور علم و ہدایت۔ عدل و انصاف۔ امن و سکون کی روشنی کو پھیلاتے اور کرۂ ارض پر تقدیرِ الٰہی کو مقدر کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ کاوشیں پہلی چار صدی ہجری تک روبہ عمل رہیں (ساتویں صدی عیسوی سے ۱۰ صدی عیسوی تک) مسلم تمام دنیا پر چھایا رہا۔ عربی چار دانگِ عالم میں روزمرہ کی بولی جانے والی زبان تھی۔ اسی لئے قرآن کریم کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوئی!!!

اسلام کی ترقی چار صدی ہجری بعد رُو بہ زوال ہوئی۔ اسلام پر ملوکیت کے مسلّط ہونے کے اثرات چار صدی ہجری کے بعد نمایاں طور پر محسوس ہونے لگے۔ اسلام میں تحقیق و تدقیق کی جگہ تقلید و تقیید نے لے لی۔ تلاش و جستجو۔ مشاہدہ و تجربہ کی بجائے خوشہ چینی۔ تفسیر و تشریح در آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم عوام علم سے دور اور تقلید کے عقیدے میں پھنس کر رہ گئے۔ سرچشمۂ ہدایت (قرآن کریم) سے دُور ہوتے گئے۔

ہندو ماحول میں شنکر اچاریہ۔ رامانج۔ کبیر بھگت۔ گورو نانک نے اس برہمنیت کے بُت کو توڑا۔ یورپ میں مارٹن لوتھر۔ جان وائے کلف (دو نواسین میں مسلم یونیورسٹی قرطبہ کے فارغ التحصیل تھے) نے پاپائیت کے خلاف محاذ قائم کیا۔ دورِ ریفارمیشن کا دروازہ کھل گیا۔ یورپ ۱۵ صدی عیسوی سے برابر آگے بڑھنے لگا۔ (اسپین کا سقوط ۱۴۹۲ء میں ہوا اور ۱۵۰۹ء تک مسلم کا نام و نشان اسپین سے مٹا دیا گیا) ۱۹ صدی کے آخر میں دیانند نے آریہ سماج کی تحریک شروع کی۔ مورتی پوجا۔ ذات پات کے بندھن ڈھیلے ہوئے اور تعلیم کا الاؤ روشن کر کے ہندو قوم کو بیسویں صدی میں آزاد اور حاکم بنا دیا۔ اب وہ سیکولر کے پردے میں سب کچھ کر رہے ہیں۔ جو دیانند چاہتے تھے۔

انیسویں صدی میں اہلِ اسلام کے اندر شمالی افریقہ میں سنوسی اور سوڈان میں مہدی سوڈانی کی تحریکات۔ عرب میں ابن عبدالوہاب کی علمی کاوش۔ برصغیر میں سرسیّد کا ولولہ انگیز کردار افغانستان و ایران میں سیّد جمال الدین افغانی کے علمی جہاد نے سوتی ہوئی خفتہ بخت اُمتِ مسلمہ کو جھنجھوڑا۔ خواب گراں سے بیدار کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد عالم اسلام آزاد تو ہوا مگر یورپ کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ابھی تک سنبھل نہیں سکا۔ آپس میں دست و گریبان اور فقدانِ اتحاد کا شکار ہے۔

بیسویں صدی کے شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال والبلاغ (۱۹۱۱ء/۱۹۱۴ء) علی برادران کا کامریڈ (کلکتہ) ہمدرد (دہلی) مولانا ظفر علی خان کا زمیندار (جو ان کے والد مولوی سراج صاحب نے شروع کیا تھا) نے عامیانِ ہند میں بالعموم اور اسلام کے پیروؤں میں بالخصوص خیال و فکر کی آزادی کے لئے نہایت جاندار کام سرانجام دیا۔ کیونکہ حالی مرحوم اپنے نوحہ انگیز کلام سے زمین تیار کر گئے تھے۔ ایک طرف شاعر اسلام نے اپنے فکر انگیز کلام سے اہل ہند کو گرمایا۔ دوسری طرف ضلع سرگودھا (انگہ) کے ایک پیر خاندان کے ایک مردِ مجاہد نے اسلامی فکر و نظر کا دروازہ کھولا تقلید کے ناروا بوجھ سے عام مسلمانوں کو آزاد کرانے کے لئے قرآن کی مشعل کو پھر روشن کیا۔ لاہور جیسے شہر کو اپنے درس و تدریس کا مرکز بنایا۔ شروع میں نہایت نامساعد حالات میں رہنا پڑا۔ اہلِ اسلام کے ایک مخصوص طبقہ نے تکفر کا نشانہ بنایا۔ مشکلات پیدا کیں۔ زہر دینے کا انتظام کیا گیا۔ قتل کی کوشش کی گئی۔ مگر وہ خدا کا بندہ دورِ صفویت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا۔

ان کا جُرم صرف یہ تھا کہ قرآن کریم بلا واسطہ عوام کو پڑھانے کے داعی تھے۔ مگر اسلام کے برہمن اس کے سخت خلاف تھے۔ وہ چودہ علوم کے واسطے کے بغیر قرآن کریم کا درس دیتے تھے۔ اہل لاہور کو خوب معلوم ہے کہ سنہری مسجد میں صبح کے وقت، میائی دروازہ میں اونچی مسجد میں مغرب کے بعد قرآن کریم کا درس تدریس جاری رہا۔ یہ سلسلہ کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے یہاں تک کہ لاہور کے علم و ہنر کے بلند ستون اور دانش و حکمت کے روشن چراغ ان کے حلقہ درس سے متاثر ہوئے۔ ان میں ڈاکٹر تاثیر مرحوم۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم (مجھے ذاتی طور پر علم ہے (۱۹۳۲ء/۱۹۲۴ء) خلیفہ شجاع الدین۔ حکیم احمد شجاع۔ عبدالکریم شورش۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی۔ پروفیسر علم الدین سالک۔ مولانا محمد بخش مسلم جو اس وقت کوآپریٹو سوسائٹی بنک میں ملازم تھے۔ ابھی زندہ ہیں۔ ان کے ولولہ انگیز درس سے متاثر تھے اور ان کے حلقہ درس میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ ان کے اس درس کے انداز کی بناء پر خلیفہ شجاع الدین مرحوم اور شیخ عظیم اللہ جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سر پر آوردہ عہدیداران تھے۔ نے انکو اشاعت اسلام کالج انجمن حمایتِ اسلام لاہور میں بطور وائس پرنسپل قرآن کریم بلا واسطہ سبقاً سبقاً پڑھانے کا کام سونپا۔ کوئی مشاہرہ قبول نہ کیا صرف آمدورفت کا الاؤنس لیتے تھے۔ اسی اشاعت اسلام کالج کے فارغ التحصیل طلبہ سے ایک عبدالحمید مرزا تھے۔ جو جامع مسجد آسٹریلیا بلڈنگ کے خطیب تھے جن کے پیچھے بانیٔ پاکستان قائد اعظمؒ نے جمعہ کی نماز ادا کی۔ اس وقت قائداعظمؒ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں لاہور تشریف لائے تھے۔ موجودہ مولانا عبدالستار خاں نیازی بھی اسی کالج کے فارغ التحصیل طلبہ سے ہیں۔ یہ اس وقت فیڈریشن کے روح رواں تھے۔ اور قائداعظمؒ کے خصوصی منظورِ نظر تھے۔ کیونکہ اس وقت پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کا طوطی بولتا تھا۔ صرف ڈاکٹر اقبالؒ (جو مسلم لیگ پنجاب کے صدر) اور ملک برکت علی واحد مسلم لیگ کے نمائندہ پنجاب اسمبلی میں تھے۔ (۱۹۳۸ء میں قائداعظم پشاور گئے تو کسی خان کو گھر پر مہمان بنانے کی ہمت نہ پڑی وہ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے تھے) پنجاب میں نواب ممدوٹ کی کوٹھی مہمان گھر تھا۔ ڈاکٹر اقبال کی قدآور شخصیت کی موجودگی میں حکومت پنجاب مسلم لیگ کے کارکنوں پر بآسانی ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی، حالانکہ قدم قدم پر رکاوٹ موجود تھی۔ قیام لاہور کے دوران قرآن کریم کو بلا واسطہ پڑھانے والے سے ممدوٹ کی کوٹھی پر ملاقات کی تھی۔ قائد کو کلکتہ میں علماء کی ایک کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا۔ وہ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر پہنچ نہیں سکتے تھے۔ قائد نے ان کو اپنے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے ہدایات دے کر بھیجا تھا۔

مولانا مصداق حسین خطیب بادشاہی مسجد لاہور کی وفات کے بعد انہی کو خطیب بادشاہی مسجد لاہور بنایا گیا۔ وزیر اعلیٰ اور سکندر حیات خاں۔ وزیر تعلیم میاں عبدالحی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اسی عہدہ جلیلہ کے دوران محکمہ اوقاف قائم کرنے کی سعی کی۔ محکمہ اوقاف قائم ہوا تو اسی

(اسکا باقی حصّہ صفحہ (۱۱) پر ملاحظہ فرمائیں)

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی مایۂ ناز تصنیف

مطالب الفرقان

کی اہمیت اور مقبولیت کے پیشِ نظر اسے مجلہ طلوعِ اسلام میں قسط وار شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ الفاظ قرآن کریم کی ہر سورۃ (بجز سورۃ التوبہ[1]) کے آغاز میں ملتے ہیں۔ بعض حضرات اُسے ایک آیت قرار دیکر متعلقہ سورۃ کا جزو قرار دیتے ہیں۔ اور اس سورۃ کی آیات کے شمار کرنے میں اُسے بھی شامل کر لیتے ہیں۔ بعض اُسے متعلقہ سورۃ کا جزو قرار نہیں دیتے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ الفاظ شروع میں تبرکاً لکھدیے گئے ہیں۔ یہ فنی یا اصطلاحی بحثیں ہیں۔ جو ہمارے نزدیک چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ سورۃ النمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو جو خط لکھا تو اس کا آغاز اس طرح سے کیا: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲۷/۳۰) اس اعتبار سے یہ الفاظ منزل من اللہ، یعنی وحی خداوندی ہیں۔ اور ہمارے لیے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے۔

عام طور پر اس کے معنی کئے جاتے ہیں:

"شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ کے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے"

"بِسْمِ اللّٰهِ" میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کے معنے "شروع کرتا ہوں میں" کئے جاتیں۔ ان معانی کے لئے اس سے پہلے "اَبْتَدِءُ" کا لفظ محذوف مانا گیا ہے۔ جس کے معنے ہیں: "میں شروع کرتا ہوں"۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے "اَقْرَءُ" کا لفظ محذوف ہے۔ کیونکہ سورۃ اَلْعَلَقْ میں آیا ہے "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۹۶/۱)۔ کہا جاتا ہے کہ نبیؐ اکرم پر وحی کا آغاز اس آیت سے ہوا تھا۔ جس میں حضورؐ سے کہا گیا تھا کہ "تو پڑھ ساتھ نام اپنے رب کے جس نے پیدا کیا"۔ (اس آیت کا صحیح مفہوم اپنے مقام پر آئے گا۔) بسم اللہ کے شروع میں اس قسم کے الفاظ کو محذوف اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ اس میں (بِ) کے معنے "ساتھ" کئے جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس حرف کے معنے "ساتھ" بھی ہیں۔ لیکن اس کے، اس کے علاوہ، اور معانی بھی ہیں۔ یہ حرف "سبب" بیان کرنے کیلئے بھی آتا ہے۔ یعنی یہ کہنے کے لیے کہ جو کچھ یہاں کہا جا رہا یا کیا جا رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے، اس کا مقصد یہ ہے، اس کی وجہ یا علت یہ ہے۔

---

[1] کہا یہ جاتا ہے کہ سورۃ التوبہ کے شروع میں "بسم اللہ" اس لئے نہیں لکھی گئی تھی کہ یہ متعین نہیں تھا کہ یہ ایک الگ سورۃ ہے۔ یا سابقہ سورۃ۔ (سورۃ الانفال) ہی کا حصہ ہے۔

اسم کے معنیٰ لفظ "اِسم" کا ترجمہ عام طور پر "نام" کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ اس کی صفات کے معنوں میں آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ اسم (مادہ۔ س۔م۔و) کے بنیادی معنیٰ کسی ایسی علامت کے ہیں جس سے متعلقہ چیز پہچانی جائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا تعارف اس کی صفات کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس لئے صفاتِ خداوندی کو اسماء الٰہی کہا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ الحشر میں مختلف صفاتِ خداوندی بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۵۹/۲۴) "خدا کی تمام صفات حسین ترین اور کامل توازن لئے ہوئے ہیں"۔ اس لئے ہمارے نزدیک "بِسمِ اللہ" میں "اِسم" سے مراد "صفتِ خداوندی" ہے۔

اِس کے بعد "بسم اللہ" میں لفظ "اللہ" آتا ہے جو (یوں کہیئے کہ) خدا کا ذاتی نام ہے۔ اور "رحمٰن" اور "رحیم" اُس کی صفات ہیں۔

بسم اللہ کی غایت ان معانی کی رُو سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ اس کے بعد کہا جائیگا یا کیا جائے گا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور اور نمود ہو۔ یعنی یہ صفات محسوس طور پر بروئے کار آجائیں۔ جب قرآنِ کریم کی کسی سورۃ کے آغاز میں آنے والے ان الفاظ کو خدا کی طرف منسوب کیا جائے (یعنی یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے متعلق ایسا فرمایا ہے) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "خدا کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن، یا قرآن مجید کی اس آیت کو اس لئے نازل کیا ہے کہ ہماری صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کی عام نمود ہو جائے"۔ اور جب ایک عبدِ مومن اپنے کسی کام کی ابتدا ان الفاظ سے کرے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ میں اس کام کو اس لئے ہاتھ میں لے رہا ہوں کہ اس سے خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کی نمود ہو جائے۔ گویا "بِسمِ اللہ" کی غایت خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کو عملاً بروئے کار لانا ہے۔

اب سوال یہ سامنے آئیگا کہ خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت سے مفہوم و مقصود کیا ہے۔ یوں تو خدا کی تمام صفات اپنے اپنے مقام پر یکساں عظمت اور اہمیت کی حامل ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جن صفات کو خدائی پروگرام اور اس کے اتباع میں انسان کے پروگرام کی غرض و غایت بتایا گیا ہے۔ وہ خاص اہمیت کی حامل ہوں گی۔ فلہٰذا گہرے غور و تدبر کی مستحق۔ چونکہ یہ دونوں لفظ (الرحمٰن — الرحیم) سورۃ فاتحہ کے آغاز میں آرہے ہیں، اس لیے مناسب سمجھا گیا ہے کہ اِن کی تشریح وہاں کی جائے (دیکھئے ص۲۰) بنابریں آپ تھوڑا سا توقف فرمائیں۔ اور سرِدست صرف اتنا سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم نازل فرمایا ہے۔ تو اس کا بھی مقصد یہ ہے کہ انسانی دنیا میں اس کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت عام ہو جائے اور اس کے بندے جس پروگرام کو بھی ہاتھ میں لیں، اس کی غرض و غایت بھی یہی ہونی چاہیئے۔ بنابریں اس وقت میں جو (اپنی بصیرت کے مطابق) قرآنِ کریم کے معانی اور مطالب بیان کر رہا ہوں۔ اور آپ انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تو اس سے ہمارا مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ اس کی رحمت کا عام ظہور ہو جائے۔ میرے پیشِ نظر بہر حال یہی مقصد ہے اور یہی میری تمام کوششوں کا منتہیٰ اور مطلوب ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم۔

سورۃ الفاتحہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

اس آیۂ جلیلہ سے قرآنِ کریم کا آغاز ہوتا ہے۔ اور آیت کا آغاز لفظ "حمد" سے۔ عام طور پر اس آیت کے معنی یہ کئے جاتے ہیں :

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو پالنے والا ہے سارے جہانوں کا۔

غیر مسلم بالعموم اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا خدا عجیب ہے جو خود اپنے منہ سے کہتا ہے کہ تمام تعریفیں میرے لئے ہیں۔ کسی کا (بقول ان کے) اپنے منہ سے خود اپنے متعلق ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔ ان کا یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وحیٔ خداوندی کے ذریعے (جو قرآن کے اندر محفوظ ہے) انسانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ایسا کہیں اور ایسا کریں۔ لہٰذا "الحمد" سے مُراد یہ نہیں کہ خدا اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔ اس نے انسانوں سے کہا ہے کہ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو اور اُسے ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھو کہ ساری "حمد" خدا کے لئے ہے۔ اگر قرآنِ کریم کے شروع میں لفظ "قُلْ" کو محذوف تصوّر کر لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس سے مطلب یہ ہوگا کہ خدائے تعالیٰ نے انسانوں کو یہ سکھایا ہے کہ تم ایسا کہو یا ایسا کرو۔

جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے اس آیت میں (اور اسی قسم کے دیگر مقامات میں) لفظ "حمد" کا ترجمہ "تعریف" کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ قرآنی مفہوم کو صحیح طور پر واضح نہیں کرتا۔ "تعریف" کے لئے عربوں کے ہاں اور الفاظ بھی ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں وہ الفاظ خدا کیلئے استعمال نہیں ہوئے۔ اس کے لئے "حمد" کا لفظ ہی آیا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کے بنیادی اور حقیقی مفہوم کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

حمد کا مفہوم عربوں کے ہاں، کسی نہایت حسین، متناسب، نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دِل میں جو جذباتِ تحسین بے ساختہ بیدار ہوں، ان کے والہانہ اظہار کو حمد کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں :

۱:۔ جس حسن و رعنائی اور شاہکار کی ستائش کی جا رہی ہے۔ وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس

شے ہونی چاہیئے۔ غیر محسوس اور مشاہدہ میں نہ آنے والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذباتِ تحسین و ستائش پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف اس کی ان تصاویر کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں جو مرئی طور پر ہمارے سامنے آجائیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان نمود و نمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کرنے کے اپنی ستائش چاہتے ہیں۔ يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (۳/۱۸۷) وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف اُن کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں۔

۲:۔ کسی کی جس بات یا جس کام کی "حمد" کی جا رہی ہو۔ وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہیئے۔ اضطراری طور پر یا میکانکی انداز سے کسی فعل کا سرزد ہو جانا، حمد کا مستحق نہیں بناتا۔ حتیٰ کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو اس کے لیے بھی "حمد" کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ "مدح" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً "رقصِ طاؤس" میں طاؤس مستحقِ مدح ہوتا ہے۔ اور اس کا خالق (خدا) سزاوارِ حمد۔

۳:۔ "حمد" کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حمد کرنے والے کے دل کی آواز ہو۔ کسی کے دباؤ سے اس کی تعریف کرنا "حمد" نہیں مدح کہلائے گا۔ نہ ہی "حمد" میں ملمع کاری، نمائش، منافقت یا کسی کو بنانے کے لئے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ "حمد" میں جذباتِ تحسین بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں۔

۴:۔ جس چیز کی حمد کی جا رہی ہو، اس کا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر "حمد" نہیں کی جا سکتی، مبہم تصورات، دھندلے نقوش اور شکوک و تذبذب پیدا کرنے والے خیالات و معتقدات کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ "حمد" فریبِ تخیل، توہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں اُبھرتی۔ اس کا سرچشمہ وہ یقینِ محکم ہوتا ہے جو علیٰ وجہ البصیرت حاصل ہو۔

۵:۔ جن نفع بخش، کشش انگیز رعنائیوں اور حسن و تناسب کے شاہکاروں کی "حمد" کی جا رہی ہو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ درجۂ کمال تک پہنچ چکے ہوں، اور ان کی نفع بخشیاں محسوس ہوں جو آرٹ تکمیل تک نہ پہنچا ہو یا وہ انسانیت کے لئے نفع بخش نہ ہو وہ مستحقِ حمد و ستائش نہیں ہوتا۔

"آرٹ برائے آرٹ" موجبِ مدح تو ہو سکتا ہے۔ سزاوارِ حمد نہیں ہو سکتا۔ [1]

حمد کس طرح کی جا سکتی ہے

یہ ہے لفظِ "حمد" کا مفہوم محاورۂ عرب کی رُو سے۔ اور انہی معنوں میں قرآن کریم نے اِسے استعمال کیا ہے۔ جب اس لفظ پر "ال" (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ) آجائے تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ ہر قسم کی حمدیت اپنے انتہائی درجہ میں صرف خدا کے لئے ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات انسان کے قیاس و خیال و گمان و وہم سے ماورا ہے۔ اس لئے اس کی ذات کا محض ذہنی تصور حمد کے جذبات بیدار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ حمد کی شرطِ اولیں یہ ہے کہ وہ شئ محسوس و مرئی ہو۔ لہٰذا جس طرح کسی تصویر کی تحسین سے درحقیقت مصور کی حمد مقصود ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کی حمد اس کی مخلوق کی رعنائیوں اور نفع بخشیوں کو سامنے لانے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس نے خود کہا ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (۱۷/۴۴) کائنات کی ہر شے اپنے خالق کی "حمد" کی منہ بولتی تصویر ہے۔ (لفظ تسبیح کا مفہوم اپنے مقام پر آئیگا) اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی حمد اس کی پیدا کردہ کائنات پر غور و فکر ہی سے ممکن ہے۔ اس نے مومنین کی ایک صفت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ "حَامِدُوْنَ" ہوتے ہیں (۹/۱۱۲)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب حمدِ خداوندی مظاہرِ فطرت پر غور و تدبّر کی رو سے ممکن ہے تو مومنین کا بنیادی فریضہ یہ ہو گا کہ وہ اشیائے کائنات پر غور و فکر کریں۔ کائنات کے مختلف گوشوں میں تحقیقات کریں۔ اور ان کے محسوس نتائج کی نفع بخشیوں کو نوعِ انسانی کے لئے عام کر کے حمدِ خداوندی کا عملی ثبوت دیں۔ یہی ہیں وہ اربابِ فکر و نظر جن کے لئے خدا نے کہا ہے کہ: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (۳/۱۸۹) یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں۔ وہ صاحبانِ عقل و بصیرت۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ (۳/۱۹۰) جو اٹھتے بیٹھتے، لیٹے ہر آن قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳/۱۹۰) تخلیقِ ارض و سما پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اور جب ان میں ریسرچ کرنے کے بعد خالقِ فطرت کی ندرت کاریاں اور نفع بخشیاں ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آتی ہیں تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا۔ (۳/۱۹۰) اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس سلسلۂ کائنات کو نہ تو بے مقصد پیدا کیا ہے۔ اور نہ ہی تخریبی مقاصد کے لئے۔

یہ ہے خدا کی حمد اور یہ ہیں وہ اربابِ فکر و نظر اور اعیانِ تحقیق و تفحّص، جنہیں حَامِدُوْنَ کہا جائے گا۔ اور

[1] لغات القرآن جلد دوم صفحہ ۵۵۰۔

جب ان کی یہ تمام کد و کاوش خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کے عام کرنے کے لئے ہوگی تاکہ تمام نوعِ انسان اس سے بہرہ یاب ہوں، تو ان "حَامِدُوْنَ" کو مؤمن کہا جائے گا۔ انہی کو دوسری جگہ خدا نے "علماء" کہکر پکارا ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (۳۵/۲۷)

علماء کون ہیں

کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا کا نظامِ آب رسانی کس قدر تعجب خیز اور حکمت انگیز ہے! (اس نظام کی تشریح مختلف مقامات پر آئے گی۔ اس جگہ صرف اتنا ہی کہا گیا کہ) وہ فضا کی بلندیوں سے بارش برساتا ہے اور فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا۔ (۳۵/۲۷) اور اس ایک ہی پانی سے طرح طرح کی روئیدگی، پھل، پھول، اناج وغیرہ پیدا کرتا ہے۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۳۵/۲۷) اور کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ پہاڑ جو یونہی جامد مادہ کے ساکت و صامت تودے کھڑے نظر آتے ہیں خدا کے نظامِ ارتقاء کی کتنی عظیم نشانیاں اپنے اندر لئے ہیں! ان کی چٹانیں جو کہیں سُرخ ہیں، کہیں سفید اور کہیں کالی بھجنگ، ان کی ایک ایک تہہ کتنے کتنے طویل المیعاد ادوار کی تاریخ اپنے دامن میں سمٹائے ہوئے ہے! وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ۔ (۳۵/۲۸-۲۷) اور پھر انسانوں پر، مال مویشی پر اور کرۂ ارض پر موجود دیگر جاندار مخلوق پر غور کرو کہ یہ کس طرح بیشمار انواع میں بٹی ہوئی ہے اور ان میں کی ہر نوع کس طرح جداگانہ خصوصیات کی حامل ہے۔ تم ان اشیائے کائنات کو محض سرسری نظروں سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہو، لیکن خدا کے بندوں میں سے اربابِ علم و حکمت جب ان پر غور و فکر کرتے ہیں تو وہ اس کی عظمت و جبروت کے احساس سے لرز اُٹھتے ہیں: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵/۲۸) اور ان کی زبان پر بے ساختہ حمد و تحسین کے یہ الفاظ آجاتے ہیں کہ: اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵/۲۸) بے شک ان کا خالق، خدائے واحد، بے مثال غلبہ و قوت کا مالک ہے۔ لیکن وہ اس قوت اور غلبہ کو تخریب کے لئے استعمال نہیں کرتا، کائنات کی حفاظت کے لئے عمل میں لاتا ہے۔ یہی ہیں وہ اربابِ علم و تحقیق جنہیں قرآن نے علماء کہہ کر پکارا ہے اور جو عملاً خدا کی صفتِ حمدیت کے مظہر ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۴۵/۳)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مؤمنین کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خالقِ کائنات اور اس کے محکم قوانین کے متعلق حتمی یقین رکھتے ہیں۔ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (۴۵/۴) تمہاری اپنی پیدائش اور دیگر جانداروں کی افزائشِ نسل میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو کائنات کے بالحق ہونے پر یقین رکھتے ہیں یہی صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں۔ (۴۵/۴) انہی کو متقی کہا جاتا ہے: اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝ (۱۰/۶)۔ نظامِ کائنات پر غور و فکر کی اس قدر تاکید کے بعد کہا کہ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۴۵/۶) یہ وہ آیاتِ خداوندی ہیں جنہیں تیرے سامنے حق کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ان سے پوچھو کہ ان کے بعد وہ کون سی بات باقی رہ جاتی ہے۔ جس کی رو سے یہ ایمان لانا چاہتے ہیں ؟۔

یہاں تک ہم نے مادی کائنات کے مظاہرِ حمدیت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن انسان کو طبعی سامانِ زیست کے علاوہ سفرِ حیات میں صحیح راہنمائی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ راہنمائی وحی کی رو سے ملتی تھی۔ جس کی آخری کڑی قرآن کریم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو بھی مظہرِ حمدیت قرار دیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ (۱۸/۱) یعنی جب تم اس ضابطۂ قوانین پر غور و فکر کرو گے جسے اس نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ تو تمہاری زبان سے بیساختہ اس حقیقت کا اظہار ہو جائے گا کہ فی الواقعہ مستحقِ حمد و ستائش ہے۔ وہ ذات جس نے

قرآن میں غور و تدبّر

اس قسم کا ضابطۂ حیات عطا فرمایا جس میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ وہ کاروانِ انسانیت کو سیدھی راہ (صراطِ مستقیم) پر چلا کر اُسے اس کی منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی یہ حمد قرآن کریم پر گہرے غور و تدبّر ہی سے ہو سکتی ہے۔ بنا بریں مومن وہ ہیں جو خارجی کائنات میں تحقیق و تفتیش اور قرآن مجید پر فکر و تدبّر سے اس حقیقت کو دنیا کے سامنے لاتے ہیں کہ مستحقِ حمدیت خدا کی ذات ہے۔

جس ذاتِ اقدسؐ و اعظم نے سب سے پہلے اس طرح خدا کی حمد کو عام کیا۔ اسے احمدؐ کہہ کر پکارا گیا (۶۱/۶) یعنی بہت زیادہ حمد کرنے والا اور اسی سے وہ خود محمدؐ قرار پایا (۴۸/۲۹) "جس کی مسلسل و پیہم حمد کی جائے"۔ اسؐ کی حیاتِ طیبہ کے یہی عظیم کارنامے تھے جنکی بنا پر کہا

احمدؐ و محمدؐ و مقامِ محمود

گیا کہ وہ "مقامِ محمود" پر فائز ہے (۱۷/۷۹) اسؐ کے مقدس ہاتھوں سے وہ نظام قائم ہوا جسے دیکھ کر ساری دنیا پکار اُٹھی کہ فی الواقعہ مستحقِ حمد و ستائش ہے۔ وہ خدا جس نے ایسا انقلاب آفریں نظام عطا کیا۔ اور اس کے بعد سزاوارِ حمد ہے وہ پیغامبرِ انقلاب جس نے اس نظام کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔ اس نظام کا اوّلین نتیجہ یہ تھا کہ ان قوموں کی جڑ کٹ گئی جو کمزور انسانوں پر ظلم و استبداد روا رکھتی۔ اور سلب و نہب سے ان کا استحصال کرتی تھیں۔ اس کا یہ وہ نفع بخش کارنامہ تھا جس سے حمدِ خداوندی اُبھر اور نکھر کر دنیا کے سامنے آگئی۔ اس کے پیشِ نظر کہا گیا : فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۶/۴۵) ظلم کرنے والی قوموں کی جڑیں کٹ گئیں۔ اور یوں خدائے رب العالمین کی حمد صفحۂ عالم پر منقوش ہو گئی۔

جمال وجلال

ظاہر ہے کہ اس قسم کے انقلاب کے لیے ذاتِ خداوندی کے جلالی گوشے کی نمود بھی ضرورت ہو گی۔ یعنی حسنِ تخلیق کی رعنایئوں کے ساتھ غلبہ اور قوت کا مظاہرہ بھی۔ اسی لئے قرآن کریم نے جلال وجمال دونوں کا سرچشمہ خدا کی ذات کو قرار دیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ: لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (۶۴/۱) حمد و اقتدار دونوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔ اگر کائنات میں جمالیات کے ساتھ جلالیات کی نمود نہ ہو تو یہ نظام تباہ ہو کر رہ جائے۔ اقبال کے الفاظ ہیں:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری،

دوسری طرف، جو قوت واقتدار حمدیت کی مظہر نہ ہو وہ فرعونیت اور چنگیزیت بن کر رہ جاتی ہے۔ یعنی:

— جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی — اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس نے آسمانی راہنمائی کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف بھی نازل کی ہے۔ (۵۷/۲۵) کہ ان دونوں کے امتزاج سے نظامِ زندگی قائم رہ سکتا ہے۔ "مومناں را تیغ با قرآں بس است" اس لئے کہ "ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند" اگر قوت کا نگران قرآن نہ ہو تو وہ چنگیزیت ہو جاتی ہے۔ اور قرآن کے ساتھ قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ محض وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا جماعتِ مومنین ان دونوں صفاتِ خداوندی کے بروئے کار لانے سے "حَامِدُوْنَ" بنتی ہے۔

ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جب ایک عبدِ مومن (مسلمان) کہتا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اور اس کا مقصود کیا؟ اس سے واضح ہے کہ "حمدیت" زبان سے چند الفاظ دہرانے کا نام نہیں یہ ایک نظام کے بروئے کار لانے سے عبارت ہے جس میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں آسمانی راہنمائی کے مطابق نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کے لیے عام کیا جائے۔ اور جو قوتیں اس کی راہ میں حائل ہوں انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔

تفصیل ان امور کی اگلے الفاظ میں ملے گی۔

اللّٰہ

الحمد کے بعد اگلا لفظ ہے۔ لِلّٰهِ۔ یہ درحقیقت (لِ+اَللّٰہ) ہے (لِ) کے معنی ہیں "کے لئے" لہٰذا "لِلّٰہ" کے معنے ہوں گے اللہ کے لئے۔ اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" کے معنے ہوں گے "حمدیت" اپنی مکمل ترین اور انتہائی شکل میں صرف اللہ کے لئے مختص ہے۔ لہٰذا اب ہمارے سامنے لفظ اللہ آتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ (ال+اِلٰہ) سے مرکب